www.urducouncil.nic.in
قیمت: ₹10/-

یوم آزادی مبارک

آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2018

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

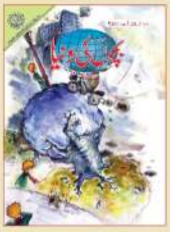
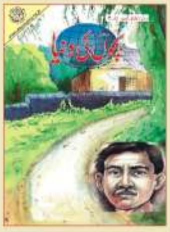

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 2 شمارہ: 8 اگست 2018

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے — صفحات: Total Pages 64

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں — نگارشات ارسال کرنے کے لیے ای میل: kduniya@ncpul.in

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی — مشیر: شعیب رضا فاطمی

فہرست

اداریہ

مکالمہ — مدیر

روبرو

حجاب امتیاز علی سے شمیم حنفی کی گفتگو — 5

جہانِ نسواں

قومی پرچم کی خالق ثریا طیب جی	شفقت جہاں	11
مسلم خواتین اور تحریک آزادی	بلال احمد میر	12
ریڈیکل تحریک نسواں	صالحہ صدیقی	23
اف یہ گرمی......	عائشہ فرحین	28
خواتین کی اختیار کاری......	خواجہ عبدالمنتقم	32

کہانیاں

سپنوں کے سائے	سیدہ اشرف	38
کلنک	سرلا دیوی	41
بک شیلف	انجم عثمانی	44
لگاؤ	ترنم جمال	46
طوفان	خلیل جبران/عزہ معین	48

حسنِ سخن

ملکہ نسیم، نسیم نکہت 51، آصفہ زمانی 52، اسنا تھ کنول، آصفہ نشاط 53

اینا پر سورام بیتا، بلقیس خان 54

باورچی خانہ

لذیذ پکوان — 55

صحت

آپ کی کمر میں............ — سید محمد حسان نگرامی — 57

آرائش و زیبائش

جلد کی خوبصورتی بڑھائیں — 59

تاثرات: نگر نگر سے — 61

قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

مقامِ اشاعت و صدر دفتر: فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066 فون: 26109746، فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مکالمہ

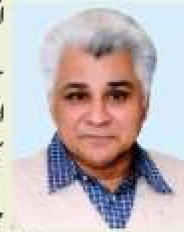

اگست کا مہینہ ہمیں ہر برس اس تاریخ کی یاد دلاتا ہے جس تاریخ کے بننے میں ایک طویل اور خونی جدوجہد کا جاں گسل مرحلہ بھی شامل ہے۔ ہم جب بھی جدوجہد آزادی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قائدین کی تصویر آجاتی ہے یقیناً یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے جنگ آزادی کی قیادت کی، انگریزوں کے ظلم و جبر کو بھی برداشت کیا، جیل گئے، اپنے بچوں اور خاندان سے علاحدگی اختیار کی لیکن ہمت نہیں ہارے اور ملک کی آزادی کے لیے مسلسل جدوجہد میں مشغول رہے۔ لیکن ان سب کے باوجود ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان قد آور رہنماؤں کے پس پشت جو خواتین کھڑی تھیں چاہے وہ ماں کی شکل میں ہوں، بہن کی شکل میں ہوں، بیوی یا دوست کی شکل میں ان کی کتنی بڑی بڑی قربانیاں ہوں گی۔ خواتین مجاہدین آزادی میں کستور با گاندھی، کملا نہرو یا پھر سروجنی نائیڈو جیسی خواتین کا نام تو ہم جانتے ہیں اس سے قبل کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو لکشمی بائی، رضیہ سلطانہ، بیگم حضرت محل یا پھر بی اماں کا نام کسی نہ کسی طرح لوگوں کی زبان پر ضرور آجاتا ہے لیکن کیا یہ فہرست اتنی مختصر ہے یا اس فہرست کو بنانے والوں نے بھی کوئی سیاست کی ہے؟ ہم اکثر جنگ آزادی کے جیالوں کی بات کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کا نام لیتے ہیں لیکن اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ حسرت موہانی کی اہلیہ نشاط النساء بیگم بھی ان اولوالعزم خواتین میں سے ایک تھیں جنھوں نے مولانا حسرت موہانی کے گرفتار ہونے کے بعد آنسو نہیں بہائے اپنے شوہر کے لیے رحم کی بھیک نہیں مانگی اپنے مائکے یا سسرال میں گوشۂ عافیت تلاش نہیں کی بلکہ مولانا کے مشن کو اپنا مشن بنا لیا اور جنگ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی صف میں کھڑی ہو گئیں اور بی اماں کے ساتھ جلسے کیے جلوس نکالے، خلافت اسٹور قائم کیا اور پھر اتر پردیش سے دہلی اور بہار کے گیا تک کا سفر کیا اور بڑے بڑے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ترکِ موالات کے بارے میں واضح کر دیا کہ مکمل آزادی کی علمبرداری کے لیے ترکِ موالات سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔

ٹھیک اسی طرح مولانا ابوکلام آزاد کی اہلیہ زلیخا بیگم کو ہم بھلے ہی فراموش کر دیں لیکن تاریخ کا وہ روشن صفحہ ہمیں بار بار دعوتِ مطالعہ دیتا ہے کہ دیکھو مولانا آزاد کے حوصلے کو صیقل کرنے والی زلیخا بیگم نے کس طرح مولانا کو آزاد رہ کر جنگ آزادی کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور فراغت مہیا کرایا۔ کبھی ان کی راہ میں سدِ راہ نہ بنیں اور حد تو اس وقت ہو گئی جب مولانا جیل میں تھے اور ادھر بیگم دِق کی بیماری سے بد حال یہ جانتے ہوئے بھی کہ جانبر نہ ہو سکیں گی مولانا کو اپنے کسی خط میں اپنی بیماری کی اطلاع نہ دی اور مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ کیا یہ معمولی واقعہ ہے اور کیا جنگ آزادی کے اس عظیم مجاہد یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کے حوصلے کی بنیاد زلیخا بیگم جیسی صابر و شاکر خاتون کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر غور کریں تو ان تمام مجاہدین آزادی جن کا نام تاریخ آزادی کی کتاب میں سنہرے حرفوں میں لکھا ہے کی اصل طاقت کا منبع آپ کو ان خواتین کی شکل میں نظر آئے گا جو پس منظر میں ہیں وہ کہیں ماں کی شکل میں بی اماں ہیں تو کہیں بہن کی شکل میں کنیزہ بیگم (چھپرہ) کہیں بیوی کی شکل میں 'با' اور کملا نہرو ہیں۔ کل ملا کر اگست کے اس ماہ میں ہم اپنی خواتین دنیا کی قلمکار اور قارئین سے عرض گزار ہیں کہ اپنے اپنے طور پر اپنے آس پاس مسلسل جدوجہد کرتی خواتین کی سدھ لیں ان کے ساتھ ایک قافلہ بنا لیں اور یہ ثابت کریں کہ ہندوستان کی خواتین کل بھی جدوجہد آزادی میں مردوں کے شانہ بہ شانہ لڑ رہی تھیں اور آج بھی ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں نمایاں مقام دلانے کے لیے سرگرم ہیں۔ آزادی کی جدوجہد کا ایک وقت تھا ہم اسے تاریخ کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن اب امن کے ماحول میں ہمیں ملک کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے۔ حکومت کی پالیسیوں کو زمین تک اور عوام کے آخری فرد تک پہنچانا ہے۔ ملک کو باوقار بنانے کے لیے آپ کو اپنے دلبندوں کے خون میں اس وطنی حمیت کا جوہر داخل کرنا ہے جس کی چکاچوندھ ان کے کارناموں سے مترشح ہو۔ تمام قارئین خواتین دنیا کو یومِ آزادی کی مبارکباد۔ شکریہ

آپ کا

[signature]

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

حجاب امتیاز علی سے شمیم حنفی کی گفتگو

شہرۂ آفاق ناول نگار، افسانہ نگار اور ترقی پسند ادیبہ حجاب امتیاز علی اردو کی نامور اور مستند تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کی سنجیدہ قاری تھیں۔ شمیم حنفی سے بات چیت میں ان کی زندگی، شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو اردو سروس سے نشر ہو چکا ہے جسے شکیل اختر نے اپنی کتاب "روبرو" میں شامل کیا ہے۔ ہم اسے شکیل اختر کے شکریے کے ساتھ خواتین دنیا میں اس لیے شائع کر رہے ہیں تاکہ موجودہ عہد کی خواتین حجاب امتیاز علی کے مزاج و منہاج سے استفادہ کر سکیں۔

شمیم حنفی: محترمہ حجاب امتیاز علی۔ یہ نام اردو افسانے کے ایک دور اور ایک عہد کا نام ہے جو زندگی یا کائنات کی طرف ایک مخصوص رویے کا ترجمان تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہ نام میرے شعور کا حصہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اردو فکشن سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگ اس نام کو اپنے ماضی کے ایک تجربے کے طور پر مستقل اپنے ساتھ رکھ رہے ہوں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محترمہ حجاب امتیاز علی کی افسانہ نگاری نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں، وہ زمانہ ہمارے یہاں رومانی افسانے کا دور کہا جاتا ہے لیکن ایک غلط فہمی رومانوی افسانے کے سلسلے میں بہت عام رہی ہے کہ رومانی افسانہ نگار زندگی کے حقائق سے دور تھے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ رومانی افسانہ نگاروں کے یہاں ایک بہت واضح میلان Radicalism کا اور اپنے معاشرے کو بدلنے کی طلب کا اور اپنے معاشرے کی تبدیلیوں کے عرفان کا نمایاں تھا۔ محترمہ حجاب امتیاز علی کی زندگی اور ان کی افسانہ نگاری اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ڈرامے لکھے اور جو مضامین لکھے اور اپنے شوہر، اردو کے ممتاز ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج کے ساتھ محترمہ نے زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے اظہار اور عمل کا جو نقش چھوڑا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ ہمیشہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کے ساتھ رہا ہے اور زندگی کے ایک انتہائی ترقی پسندانہ تصور کے ساتھ محترمہ امتیاز علی صاحبہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ادب ان کے لیے بالکل ایک ذاتی تخلیقی تجربہ تو رہا ہی ہوگا، لیکن ان کو یہ روایت ورثے میں بھی ملی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی والدہ عباسی بیگم اردو فکشن نویسی میں نہایت ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ ان کے شوہر سید امتیاز علی صاحب کا ابھی میں نے نام لیا اور محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ کا نام تو اب بھی لوگوں کے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔ بہرحال، بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج وہ اردو سروس میں تشریف لائی ہیں۔ ابھی تین برس پہلے وہ ہندوستان آئی تھیں۔ ان سے یہاں ریڈیو پر اردو سروس کے حوالے سے گفتگو ہوئی تھی اور سامعین تک ان کی آواز پہنچی تھی۔ میرے خیال میں یہ سب کے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ آج وہ تشریف لائی ہیں تو میں چاہتا ہوں کہ ان سے پھر کچھ باتیں کی جائیں۔ ہم سب آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی: جی شکریہ آپ کا۔

شمیم حنفی: کل میں نے سوچا کہ آپ سے باتیں کرنی ہیں تو گفتگو کا آغاز کس طرح کیا جائے۔ گفتگو میں آپ کو ذرا تکلف بھی ہوتا ہے۔

حجاب امتیاز علی: میری پہلی جو کہانی تھی 'میری ناتمام محبت' اس زمانے میں میں نے لکھی تھی جب میری عمر تقریباً گیارہ برس تھی اور گیارہ برس کی لڑکی کا نہ کوئی مشاہدہ ہوتا ہے اور نہ زندگی کا تجربہ ہوتا ہے۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ یہ تو خدا نے ہی لکھوا دیا۔ عزت بچائی۔ 'ناتمام محبت' ایک Long Love Story تھی اور یہ میری سب سے پہلی اسٹوری بھی تھی جب میں نے یہ کہانی ختم کی تو اس زمانے کا بہت لیڈنگ اخبار ہوتا تھا 'نیرنگ خیال' جس میں بڑے بڑے لوگوں کی تخلیق چھپتی تھی لیکن کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے میں نے یہ ہمت کی اور یوسف حسین ایڈیٹر کو

بھیج دی اور اس وقت مجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ یہ چھپے گی یا نہیں لیکن ایک مہینے کے بعد دیکھتی ہوں تو اس کی قسطیں چھپنے لگی تھیں۔ اس وقت مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اپنی طرف سے اپنے آپ کو تجربہ کار مصنفہ سمجھا کرتی تھی۔

شمیم حنفی: اچھا قطع کلام ہوتا ہے محترمہ یہاں آنے سے پہلے آپ کی کتابوں کی فہرست پر کل میں نے ایک نظر ڈالی۔ اس میں مجھے یہ نام ملے تھے۔ لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے، نغماتِ محبت، خلوت کی انجمن، اندھیرا خواب، تحفے اور شگوفے، صنوبر کے سایے، ادب ذریں، ممی خانہ، ظالم محبت اور پاگل خانہ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے میرے ذہن میں ایک بات یہ آئی کہ شروع سے آپ کے شعور پر دو میلانات کا اثر زیادہ نمایاں رہا ہے۔ ایک تو رومانی تجربے دوسرے ڈراؤنے تجربے۔ کیا آپ کو Horror سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔

حجاب امتیاز علی: کس سے۔

شمیم حنفی: Horror اور ہیبت ناک افسانوں سے۔

حجاب امتیاز علی: جی ہاں ممکن ہے کہ میں بچپن میں بزدل رہی ہوں۔ اس کے بعد تو نہیں رہی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ایک تربیت یافتہ پائلٹ بھی ہوں۔ تو بزدلی جاتی رہی لیکن Horror بھی عشقیہ ہوتا ہے عشق میں۔ اس کے مدنظر میں نے کچھ افسانے Horror پر لکھے ہیں۔ یہ رومانس کی بات ہے۔ یہ موضوع اتنا طویل اور وسیع ہوتا ہے کہ آدمی بڑی دلچسپی سے اپنے خوابوں کے جزیرے کا بھی بیان کر سکتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میرے جو رومانی ناول ہیں ان میں ایک خاص قسم کا رومان ہوتا ہے اکثر خاندان کے افراد سے۔ میں نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں۔

شمیم حنفی: کچھ لوگوں کو تو آپ نے مستقل کرداروں کی حیثیت دی ہے، جیسے ڈاکٹر گار، یا حبشی ملازمہ زوناش۔

حجاب امتیاز علی: کچھ لوگ کیا! میں اپنے افسانوں کے کرداروں کو اپنے خاندان کے لوگ سمجھتی ہوں اور یہ بھی شاید بے جا بات نہیں ہوگی کہ جو کردار ہیں میرے افسانوں کے، وہ میرے خاندان کے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ ان ہی کے کردار کو زیب داستان بنا کے میں نے لکھ دیا۔

شمیم حنفی: اچھا! ایک بات 'ساقی' کا سالنامہ جو 1960 میں شائع ہوا تھا، اس میں آپ کا ایک بیان میری نظر سے گزرا اور مجھے یہ دلچسپ لگا تھا۔ آپ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں قنوطی تو نہیں ہوں الم پسند ضرور ہوں یہ الم پسندی جو ہے اس کی کئی جہتیں ہیں اور یہ جہتیں آپ کے افسانے پر کس طرح اثر انداز ہوئیں۔

حجاب امتیاز علی: قنوطی تو میرا خیال ہے کہ میں نہیں ہوں لیکن بنیادی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ الم پسندی آدمی کو حقیقت پسندی کی طرف لے جاتی ہے۔ کیونکہ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ وہ زمانہ تو گزر گیا جب میں نے ابتدائی افسانے لکھے تھے اور معلوم نہیں کہ کس طرح میں نے الم پسندی کا لفظ استعمال کیا لیکن آج جب میں سیریس چیزیں لکھ رہی ہوں اور حیات و کائنات پر جب نظر جاتی ہے یہ دکھ کی بات یقیناً مجھ کو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ حیات و کائنات میں انسان کے لیے کچھ خاص خوش خبری نہیں ہے۔

شمیم حنفی: اچھا یہ بتایئے کہ حال میں آپ کی جو کتاب شائع ہوئی 'پاگل خانہ' جس پر پاکستان کی حکومت نے اپنے ملک کے سب سے بڑے انعام یا اعزاز تمغہ امتیاز سے نواز ہے۔ تو پچھلی ملاقات میں، جب آپ تین برس پہلے تشریف لائی تھیں، اس زمانے میں 'پاگل خانہ' مکمل نہیں ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بات یہ آئی کہ آپ کو شروع میں Horror سے یا ہیبت ناک افسانوں سے جو دلچسپی تھی یہ 'پاگل خانے' میں آپ نے آج کے صنعتی تمدن کو اور اس کی وحشتوں کو اور اس نے انسان کی زندگی کو کس طرح ویران کیا ہے، ان باتوں کو جس طرح پیش کیا ہے تو ہیبت سے اس دلچسپی کی یہ توسیع تو نہیں ہے؟

حجاب امتیاز علی: شاید، ممکن ہے، میں نے اس پر کبھی غور نہیں کیا کہ دونوں میں Connection شاید ہو۔ لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ ایک مصنف کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ اس کی جو ضروریات ہوتی ہیں، نت نئی ایجادات ہوتی ہیں۔ طرزِ زندگی بدل جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمدن اور معاشرت کا اثر کہانی پر پڑتا ہے۔ ہر ادیب پر پڑتا ہے، ادب پر پڑتا ہے۔ ادب بدل جاتا ہے۔ میری نئی کتاب جو ابھی ابھی مارکیٹ میں آئی ہے جس پر مجھے ایوارڈ ملا ہے۔ یہ (پاگل خانہ) نام میں نے یونہی شاعرانہ سوچ سے نہیں رکھا بلکہ ہفتوں کے غور و فکر کے بعد یہ نام مجھے موزوں معلوم ہوا اپنی کتاب کے لیے، کیونکہ یہ کتاب میں نے عالمی امن پہ لکھی ہے اور یہ بھی میں جانتی تھی کہ امن پہ کسی زمانے میں بھی لکھنا حماقت ہے۔

شمیم حنفی: لیکن شاید یہ ضرورت بھی ہے سب سے بڑی وقت کی۔

حجاب امتیاز علی: ضرورت تو ہے ہی۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز لیکن پھر بھی ادیب جو کچھ بھی سوچتا ہے وہ تو لکھ ہی دیتا ہے۔ تو میں نے یہ کتاب عالمی امن پہ لکھی ہے اور ایٹم کی تباہ کاریوں پر لکھی ہے اور

ساتھ ہی سائنس کی زبردست طاقت پہ بھی لکھی ہے جو انسان کے لیے بہبودی کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر وہ چاہے تو۔

شمیم حنفی: اچھا یہ فرمائیے کہ آپ کو کہا گیا ہے رومانی افسانہ نگار۔ آپ فرماتی ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کی اس نئی کتاب سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے کہ آج کی زندگی کے حقائق سے، آپ کی وابستگی کیا ہے؟ آپ کے عہد میں انسان کے سوچنے کا انداز کس طرح بدل رہا ہے؟ ان تمام چیزوں سے آپ کو دلچسپی رہی ہے۔ آپ اس میں خود کوئی تضاد محسوس کرتی ہیں جب آپ کو لوگ رومانی افسانہ نگار کہتے ہیں تو کیوں کہتے ہیں؟

حجاب امتیاز علی: بات یہ ہے کہ ہر ادیب یعنی افسانہ نگار رومان پسند ہوتا ہے۔ تو اس میں برائی کیا ہے؟

شمیم حنفی: میرے نزدیک بھی کوئی برائی نہیں۔

حجاب امتیاز علی: کیونکہ رومان پسندی کا مطلب یہ ہے کہ Love Story ہو یا رومانی انداز ہو۔

شمیم حنفی: انسان کے داخلی تجربوں سے دلچسپی!

حجاب امتیاز علی: محبت تو افسانہ ہے۔ انسان کی بنیادی Instinct ہے۔ تو کیا برائی ہے اگر میں رومان پسند ہوں؟

شمیم حنفی: اچھا ایک بات اور جو آپ کے کرداروں کے سلسلے میں ذہن میں آتی ہے۔ اسی بات سے وہ بات نکلتی ہے۔ آپ کے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے کرداروں پر نظر ڈالتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ کرداروں کے خارجی عمل سے زیادہ آپ کی توجہ ان کے باطنی منظر نامے پر ہوتی ہے Inner Landscape پر۔ وہ کس طرح محسوس کرتے ہیں؟ کس طرح سوچتے ہیں؟ آپ بھی بہت سوچتی اور محسوس کرتی ہیں۔ آپ کے بارے میں جو تحریریں سامنے آئیں ان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے اور آپ کے ناولوں میں جو فضا آفرینی ملتی ہے، اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ رنگوں کو جس طرح محسوس کرتی ہیں۔ موسموں کو جس طرح محسوس کرتی ہیں، مناظر اور مظاہر کو جس طرح محسوس کرتی ہیں۔ تو کیا آپ کو نفسیات سے بھی خاص طرح کی دلچسپی رہی ہے؟ کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ انسان کو سمجھنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کے باطن کو سمجھا جائے؟

حجاب امتیاز علی: یہ آپ نے نفسیات کا ذکر کیا تو میں کہہ دوں کہ نفسیات تو بعد کی چیز ہے اور ادیب اس سے پہلے۔ نفسیات تو ویسے ہی آ گئی ہوگی لیکن جو فضا میں بیان کرتی ہوں یہ نقل تو نہیں لگتی؟

شمیم حنفی: نہیں قطعی نہیں اور اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے سگمنڈ فرائڈ کو باطن کی دنیا کا سیاح کہا گیا تو اس نے کہا کہ

'مجھ سے پہلے یہ سیاحی ادیب اور صوفی کر چکے ہیں'۔

خیر ادیب کا تو یہ تجربہ رہا ہے، لیکن آپ کو جس قسم کی دلچسپی رہی ہے، مثال کے طور پر رنگوں سے، روشنیوں سے، لو سے، دھوپ سے، جاڑے سے، بدلتے ہوئے مناظر سے، بادلوں سے۔ رنگوں کا ایسا زبردست شعور آپ کے یہاں ہے، جو ایک عجیب وغریب اور زبردست تخلیقی تجربہ ہے Fiction میں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت زبردست تخلیقی رجحان رہا ہے۔ کیا آپ کو مصوری سے بھی کوئی دلچسپی رہی ہے؟

حجاب امتیاز علی: بہت زیادہ۔ اگرچہ میں تصویر نہیں کھینچتی لیکن جب کوئی تصویر ہوتی ہے تو اسے باقاعدہ دیکھتی ہوں۔ کوئی نقاد نہیں ہوں تصویروں کی۔ تاہم اس کا حسن اگر ہے تو میں محسوس کر لیتی ہوں۔ جہاں بھی کوئی حسن ہو، موسم میں ہو، تصویر میں ہو، کتابوں میں ہو۔

شمیم حنفی: یا جانوروں میں ہو جیسے بلیوں کی تو آپ خاص طور پر شیدائی رہی ہیں۔

حجاب امتیاز علی: آپ کو تو علم ہوگا کہ میں ادب میں جمال پرست کی حیثیت سے بدنام ہوئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں بدنامی کی کیا بات ہے۔؟ میں حقیقت کی باتیں بیان کرتی ہوں۔ جب میں شام کا، ایک گلابی شام کا ذکر کرتی ہوں تو میں دیکھتی ہوں کہ شام کا رنگ واقعی گلابی ہوتا ہے۔

شمیم حنفی: عام آدمیوں کے بارے میں تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ مناظر سے اتنے مانوس ہو جاتے ہیں کہ رنگ کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ان کے یہاں آسمان صرف آسمان ہے۔ نیلا نہیں ہے یا کوئی اور رنگ جیسے آسمان جو رنگ بدلتا ہے وہ نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ آپ تو ایک فنکار کی نظر سے اس کو دیکھتی ہیں۔ اچھا اب ہم پھر آپ کے بعض تصورات کی طرف آتے ہیں۔ آپ نے ادھر اپنی بعض بات چیت کے دوران یا Interviews میں نئی عورت کا بھی ذکر کیا ہے یا یہ کہ کس طریقے سے معاشرے میں عورت اپنے آپ کو سامنے لاتی ہے۔ ایک مفید کردار کے طور پر باقاعدہ project کرتی ہے اپنے پورے وجود کو۔ ظاہر ہے کہ آپ کا تعلق ایک ایسے طبقے سے رہا ہے جس کا ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی زندگی سے بھی گہرا تعلق تھا۔ خود آپ کی ملاقاتیں بہت سے ممتاز لوگوں سے رہی ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے اقبال سے ملاقات کا بہت تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ آپ

ہندوستان کی پہلی خاتون پائلٹ تھیں۔ اتفاق سے یہ بات میرے علم میں ابھی ابھی آئی۔ عورتوں کی آزادی کے مسائل سے بھی آپ کو دلچسپی رہی ہے۔ ادھر آپ نے جو افسانے لکھے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ آپ کے یہ خیالات جو اپنی صنف کے بارے میں ہیں کس طریقے سے ان کی ترجمانی آپ کی کہانی اور آپ کے ناولوں سے ہوتی ہے؟

حجاب امتیاز علی: بات یہ ہے کہ Social موضوعات پر میں نے بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ آیا بلا مقصد آ گیا ہے۔ بلا ارادہ! عورت وہ ہے جسے میں سمجھتی ہوں کہ عورت کو ایسا ہونا چاہیے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ جس قسم کی عورت کا میں تصور کرتی ہوں اسلام میں پہلے ہی سے وہ عورت موجود ہے۔ کیونکہ اسے سارے حقوق حاصل ہیں۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو مردوں کے نسبت کمتر ہو اور اگر میں نے اپنے افسانوں میں کسی عورت کا ذکر کیا ہے تو یہ نہیں کہ میں نے مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ میں نے صرف اپنے احساسات کی بنا پر ایسی عورتوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

شمیم حنفی: اچھا آپ کا براہِ راست تعلق فلم سے کن سطحوں پر رہا؟ فلم سازی کے شعبے سے؟

حجاب امتیاز علی: جی نہیں میرا تعلق فلم سے تو نہیں رہا۔

شمیم حنفی: کیونکہ تاج صاحب کا تعلق فلم سازی کے شعبے سے تھا اس لیے میرے ذہن میں یہ بات آئی۔

حجاب امتیاز علی: تاج صاحب کا تو بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ Partition کے بعد بھی بمبئی آتے جاتے رہے اور ساری فلم انڈسٹری تاج صاحب کو جانتی تھی بلکہ جب یہ حادثہ ہوا، تاج صاحب کی شہادت کا تو بمبئی کے فلم والوں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا، بلکہ انھوں نے تو لکھا کہ ان کی یاد اور احترام میں ایک منٹ کے لیے ہم اپنا Floor بند کرتے ہیں۔

شمیم حنفی: ریڈیو سے آپ کا تعلق تو بہت گہرا رہا ہے اور بہت طویل رہا ہے۔

حجاب امتیاز علی: میرا حال یہ ہے کہ جب بھی ریڈیو والے بلاتے تھے تو میں چلی جاتی تھی اور جو موضوع وہ دیتے تھے اسی پر میں بولا کرتی تھی۔ پہلے کی بات اور ہے۔ بہت زیادہ بلایا جاتا تھا۔ آج کل، اب ٹیلی وژن بھی آ گیا ہے اور فلمیں بھی آئی ہیں تو ریڈیو ذرا Background میں چلا گیا ہے۔

شمیم حنفی: ان ذرائع ابلاغ کو آپ کہاں تک موثر سمجھتی ہیں؟ یعنی اپنے خیالات کے ترسیل کے سلسلے میں، ریڈیو اور ٹی وی کو آپ کس حد تک کارگر سمجھتی ہیں؟

حجاب امتیاز علی: جی سب سے پہلے تو میں اصل میں ایک ادیب ہوں اس لیے کتابوں کو سب سے زیادہ کارگر سمجھتی ہوں، پھر ٹیلی وژن ہے جس میں معاشرت بھی دکھائی جاتی ہے اور تمدن بھی اور آج کا آدمی اور آج کا ادب اور آج کی عورت سبھی دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ریڈیو کا کیا کہنا۔ ریڈیو تو بہت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ مفید رہی ہے اور رہے گی۔

شمیم حنفی: اچھا اس وقت پاکستان میں آپ کا قیام بھی ایک ایسے شہر میں ہے جو شہر ہی نہیں ایک تہذیبی مرکز بھی ہے یعنی لاہور۔ اور اگر دنیا کے چند ایسے شہروں کا نام لیا جائے جن کے چہرے پہچانے جاتے ہیں تو ان میں ایک شہر لاہور بھی ہے۔ لاہور نے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور یہ کہ بہر حال آج ایک ایسے میلان کے قائدین میں آپ کا شمار ہوتا ہے جو اردو میں خاصے مقبول رہے۔ اپنے زمانے کے لکھنے والوں سے آپ کے رابطے کی نوعیت کیا ہے۔

حجاب امتیاز علی: آج کل کے

شمیم حنفی: آج کل کے لکھنے والوں سے

حجاب امتیاز علی: جی آج کل لکھنے والے ہم بھی آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ کبھی جلسوں میں، کبھی کہیں، کبھی کہیں، بلکہ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے اپنے گھر پر ایک جلسہ کیا تھا۔ یہ خالص ادیبوں کا تھا اور اس کا نام میں نے من و سلویٰ رکھا ہے۔

شمیم حنفی: تواضع بھی ہوتی تھی وہاں۔

حجاب امتیاز علی: جی جی من و سلویٰ کا طریقہ یہ تھا۔ میں نے اس کا Constitution بھی لکھا تھا اور سارے ادیبوں کو دیا تھا اور ووٹ کے ذریعہ اس کے آٹھ ممبر چنے جاتے تھے۔ میں نے اس کے آئین میں لکھا تھا کہ ہر ممبر اپنی جیب میں ایک موم بتی یا ایک تازہ افسانہ یا ایک نظم اور دوسرے ہاتھ میں ایک کھانے کی ڈش لے کر آئے۔

شمیم حنفی: جو گھر سے لے کر آئے

حجاب امتیاز علی: اپنے گھر سے لے کر آئیں۔ اگر بیس ممبر ہیں تو بیس کھانے آتے تھے۔ بیس موم بتیاں، بیس شعر یا نظم یا کہانیاں! اب آپ یہ پوچھیں کے موم بتی کی کیا ضرورت تھی؟ تو آپ جانتے ہوں گے، لوڈ شیڈنگ وہاں بھی ہوتا ہوگا، لاہور میں بھی بجلی اچانک فیل ہو جاتی تھی تو پھر تسلسل ٹوٹ جاتا تھا اور لطف بھی جاتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے بہت سوچ سمجھ کر Constitution میں لکھا کہ ہر ادیب کی جیب میں ایک ٹارچ یا موم بتی ہونی چاہیے۔

شمیم حنفی: اچھا میں یہ سمجھتا تھا کہ شاید کوئی فضا پیدا کرنے کے لیے ایسا کرتی تھیں۔ مثلاً بلب بجھا دیے جائیں اور شمع روشن کر دی جائیں۔

حجاب امتیاز علی: وہ بھی ہوتا تھا۔ روشنیوں پر خاص غور کرتی ہوں کہ روشنی کا جذبات پر اثر پڑتا ہے، میرے اپنے جذبات پر۔ اگر سارے کھڑکی دروازے بند ہوں تو میں گھبرا جاتی تھی۔ اب دیکھیے میں نے اپنی ساری کتابیں تقریباً درختوں کے سائے میں لکھی ہیں۔ درختوں کے نیچے بیٹھ کر لکھتی ہوں۔ کوئی کتاب بھی مجھے ایسی یاد نہیں جو میں نے بند کمرے میں لکھی ہو جیسے یہاں بیٹھ کر بھی میری طبیعت گھبرائی ہوئی ہے کیونکہ جب تک میں نیلے آسمانوں کو نہ دیکھوں، ہوائیں چلتی ہوئی، ٹہنیاں لہراتی ہوئی، بے چین رہتی ہوں۔

شمیم حنفی: لو کے موسم میں بھی کھڑکیاں کھلی رہیں اور آسمان دکھائی دیتا رہے۔

حجاب امتیاز علی: یقیناً! جی ہاں۔

شمیم حنفی: اچھا اس وقت آپ کے آئندہ منصوبے کیا ہیں یعنی 'پاگل خانہ' تو آپ نے مکمل کر لیا۔ اسے بہرحال آپ کا Magnum-Opus کہا جائے گا یا ایک عمر کے تجربے کا حاصل کہا جائے گا وہ کتاب تو سامنے آ گئی۔ لیکن خدا کے فضل سے آپ کی صحت ابھی اچھی ہے اور آپ کا ذہن بہت چاق و چوبند ہے اور ظاہر ہے کہ آپ مستقل سوچ رہی ہیں۔ تو آئندہ کے لیے کیا منصوبے ہیں؟ آپ اب اور کیا لکھ رہی ہیں اور آپ ان دنوں کیا سوچ رہی ہیں؟

حجاب امتیاز علی: نہیں، منصوبہ تو میں کبھی بناتی ہی نہیں ہوں۔

شمیم حنفی: اچھا بس بے ارادہ جو ہو جائے؟

حجاب امتیاز علی: لیکن یہ کہ ہمیشہ لکھنے کا ہی منصوبہ ہوتا ہے۔ ساری زندگی قلم ہاتھ میں لیے ختم کر دی اور آج بھی میں ساڑھے آٹھ گھنٹے لکھتی ہوں۔

شمیم حنفی: ساڑھے آٹھ گھنٹے روزانہ؟

حجاب امتیاز علی: بالکل!

شمیم حنفی: کتنے صفحات لکھ لیتی ہیں آپ اتنی دیر میں؟

حجاب امتیاز علی: یہ تو میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتی! یہ تو میری سوچ پر منحصر ہوتا ہے۔ کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر بیٹھے بیٹھے گھنٹوں سوچنا پڑتا ہے۔ تو میں ٹہلنے لگتی ہوں۔ کبھی نرگس کے پودوں میں، کبھی موتیا کی جھاڑیوں میں، ساڑھے آٹھ گھنٹے اگر اتفاقاً نہ لکھوں تو نو نو گھنٹے پڑھتی رہتی ہوں۔ لکھنے اور پڑھنے کے علاوہ میرا کوئی خاص مشغلہ ہی نہیں ہے۔ تو یہی جاری ہے گا جب تک میں زندہ ہوں۔

شمیم حنفی: صاحب! یہ تو بہت خوبی کی بات ہے۔ آپ کے ساتھ انسانوں کے علاوہ دوسرے جانور بھی ہیں؟ گھر میں ابھی بلیاں بھی محفوظ ہیں؟

حجاب امتیاز علی: جی! جانوروں میں میری ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔

شمیم حنفی: ایک طوطے جعفر کا تو میں نے آپ کی کئی تحریروں میں ذکر پڑھا تھا!

حجاب امتیاز علی: جی۔ میرے ایک طوطے کا نام جعفر تھا۔ میرے پاس ایک زمانے میں اٹھائیس بلیاں تھیں۔ اس کے علاوہ کئی اور جانور بھی تھے۔ کیونکہ جانوروں کا میں تو وہی احترام کرتی ہوں جو انسان کا احترام ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی بلّی ذرا معمر بلّی اگر کرسی پر بیٹھ گئی تو میں اسے ہٹاتی نہیں ہوں بلکہ دوسری کرسی کھینچ کے بیٹھ جاتی ہوں۔ جانوروں سے تو مجھے بڑی محبت ہے۔

شمیم حنفی: تو اب 'پاگل خانہ' کے بعد آپ کس قسم کی کوئی کتاب لکھنا چاہتی ہیں۔ ہر مصنف سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے شاید کہ کوئی ایسی کتاب ضرور ہوتی ہو گی؟ اس کے ذہن میں جو لکھی نہیں ہوتی اس وقت تک، یعنی کہ جس کو وہ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

حجاب امتیاز علی: بالکل۔؟

شمیم حنفی: تو آپ کے ذہن میں کوئی ایسا تصور، کوئی ایسا موضوع، کوئی ایسا تجربہ؟

حجاب امتیاز علی: جی ہاں میری ایک کتاب نامکمل ہے جس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اس کا نام ہے 'طویل روشن گرمیاں'۔ اس میں میرے وہ سارے کردار ہیں جو عام طور پر آتے رہے ہیں افسانوں میں۔ اور دل کھول کے لکھ رہی ہوں۔ لیکن وہ بھی خالص رومانی کتاب نہیں ہو گی۔ رومانی ہوتے ہوئے بھی اس میں حیات اور کائنات کے کئی اشارے ہوں گے۔

شمیم حنفی: بہرحال یہ غیر معمولی مسرت کی بات تھی کہ آپ سے اس وقت اتنی گفتگو ہوئی۔ ابھی تھوڑا سا وقت ہے کہ آپ جو کتاب لکھنا چاہتی ہیں یا جو کچھ لکھ رہی ہیں اس کے بارے میں کچھ بتا دیجیے۔ اس کے موضوعات کیا ہیں؟

حجاب امتیاز علی: یہ طویل روشن گرمیاں؟

شمیم حنفی: طویل روشن گرمیاں کے علاوہ بھی کچھ افسانے آپ

نے ادھر لکھے؟

حجاب امتیاز علی: افسانے تو میں میرا خیال ہے ہر مہینے لکھتی ہوں۔ وہ تو سینکڑوں کے حساب سے۔ میرے افسانے اتنے ہو گئے کہ مجھے خود ہی یاد نہیں کہ میں نے کتنے لکھے۔

شمیم حنفی: اچھا آپ نے اظہار کے لیے اپنے افسانوں اور ڈراموں میں سب سے زیادہ کس صنف کو اپنے مزاج کے مطابق پایا؟

حجاب امتیاز علی: بات یہ ہے کہ چھوٹی کہانی وہ جس میں کوئی بڑی بات کہی جاتی ہے۔ ناول وہ چیز ہے کہ جس میں آدمی دل کھول کر لکھتا ہے اور ڈرامہ بالکل Mathematics کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں ہر بات کی احتیاط رکھنا پڑتی ہے اور کوئی فالتو بات نہیں۔ ایک ایک قدم ایک ایک لفظ مقصدی ہوتا ہے اور ڈرامہ خاصی مشکل چیز ہوتی ہے۔

شمیم حنفی: بے شک! تو بہرحال آپ اس وقت 'طویل روشن گرمیاں' لکھ رہی ہیں اور افسانے تقریباً ہر ماہ ایک۔ دو آتے رہتے ہیں، ڈرامے بھی مسلسل لکھ رہی ہیں آپ۔ اس کے علاوہ مزید کچھ؟ عام مسائل پر۔ آپ کے تجربے کتنے دلچسپ رہے ہیں؟

حجاب امتیاز علی: جی وہ بھی لکھتی ہوں۔ جب یورپ گئی تھی تو میں نے ایک طویل سفرنامہ لکھا تھا۔ وہ ادبی رنگ میں تھا حقیقت بھی تھا اور وہ لاہور کے 'مشرق' اخبار میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ یہ بھی بہت پسند کیا گیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ جب میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو مجھے بھی قارئین کا خیال نہیں آتا۔ بعض لوگ جب لکھتے ہیں تو قارئین کا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ادب برائے ادب کی میں قائل ہوں۔

شمیم حنفی: لیکن بہرحال دوسرے اس پر اپنا حق کسی نہ کسی طرح قائم کر ہی لیتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی: جی ہاں یہ تو میرے قارئین کی عنایت ہے کہ پسند کر لیتے ہیں۔ اگر اتفاق سے ناپسند بھی کریں تو میں دل شکستہ نہیں ہوتی کیونکہ جو چیز میں نے لکھی اپنے لیے لکھی۔

شمیم حنفی: بہرحال یہ ہمارے لیے غیر معمولی اعزاز اور مسرت کی بات ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہوئی اور اردو سروس سننے والوں تک آپ کی آواز پہنچی۔ ہماری دعا یہ ہے کہ آپ بار بار تشریف لائیں اور اس طرح ہمیں موقع ملتا رہے آپ سے گفتگو کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ ایک طویل اور بہت سرگرم تخلیقی زندگی گزارنے کے بعد آپ کا قلم اور آپ کا ذہن جس طرح رواں دواں زندہ اور تابناک ہے، اسے دیکھ کر یہ امید بندھتی ہے کہ ابھی اردو فکشن کو آپ جو کچھ دینا چاہتی ہیں اس کا وہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گی۔ ہماری دعا ہے کہ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔

حجاب امتیاز علی: آپ کی بڑی نوازش! مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں یہاں آئی۔

شمیم حنفی: ایک بات اور آپ سے پوچھ لیں چلتے چلتے۔ وہ یہ کہ آپ یہاں تین برس پہلے بھی آئی تھیں۔ ابھی بھی آئی ہیں کیا محسوس کرتی ہیں آپ؟ آپ کا سفر کیسا تجربہ ہوتا آپ کے لیے؟

حجاب امتیاز علی: جی جب بھی میں یہاں آتی ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ریاست حیدر آباد کی رہنے والی تھی۔

شمیم حنفی: ولادت تو آپ کی وہیں کی ہے؟

حجاب امتیاز علی: جی ہاں وہیں کی ہے۔ تو جب بھی میں آتی ہوں بہت خوش ہوتی ہوں۔ وہی نیلا آسمان جو پاکستان پر چھایا ہوا ہے وہی نیلا آسمان ہندوستان پر بھی ہے۔ خوش رہتی ہوں۔

شمیم حنفی: بہرحال اب گفتگو اس منزل تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارا وقت بھی ختم ہو رہا ہے۔ ہم آپ کا پھر ایک بار شکریہ ادا کرتے ہیں اور پھر اس خواہش کا اظہار کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح تشریف لائیں۔ کیونکہ آسمان کا رنگ جو آپ کو پسند ہے۔ ایسا ہی رہے گا انشاء اللہ

حجاب امتیاز علی: انشاء اللہ۔

(تاریخ نشر 13 مئی 1983)

فرہنگ آصفیہ سے

شاخانہ یا شاخسانہ ۔ا۔ف۔ اسم مذکر۔ مرکب از شاخ۔ شانہ۔ (۱) حجت۔ تکرار (۲) رخنہ۔ عیب۔ خلل۔ نقص۔ تنداء کلنک۔ الزام۔ بہتان۔ تہمت۔ عیب گیری۔ عیب جوئی (۳) فتنہ۔ فساد۔ جھگڑا۔ ٹنٹا (۴) بحث۔ دلیل (۵) شک۔ شبہ۔ بد گمانی۔ گمان بد

کب دیا دل میں تیری زلفوں کو
یہ بھی لوگوں کا شاخسانہ ہے (سوز)

(۶) ڈھکوسلا۔ دم۔ فریب۔ دھوکا۔ گھڑت

مشک وسنبل کہاں وہ زلف کہاں
شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں (میر)

حدیث سرِ زلف کیا کوئی سمجھے
کہ اس بات کے شاخسانے بہت ہیں (مصحفی)

باقی مثالیں اس کے مشتقات میں دیکھو۔

شفقت جہاں

قومی پرچم کی خالق ثریا طیب جی

کسی بھی ملک کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے لیے اس کے قومی پرچم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ دنیا کے جتنے بھی ممالک ہیں سب کا اپنا ایک قومی پرچم ہے جو شان وشوکت اور عظمتوں کا نگہبان ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان آزاد ہوا تو ہمیں بھی ایک ایسے قومی پرچم کی ضرورت تھی جس کے ذریعے ہم اپنے تہذیبی اور ثقافتی نشان کو دنیا کے روبرو پیش کرسکیں۔ چنانچہ قومی پرچم کا نقشہ تیار کرنے کے لیے مشورے کیے گئے، اس کے کئی نقشے تیار ہوئے۔ ملک کی آزادی سے پہلے اس طرح کے قومی پرچم تیار کیے جا چکے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے کلکتہ کے گرین پارک میں 1906 میں پرچم کشائی ہوئی۔ اس پرچم میں لال، زرد اور ہرے رنگ کی تین پٹیاں تھیں۔ اس کے بعد مادام کامانے 1907 میں پیرس میں پرچم کشائی کی۔ اس کی پہلی پٹی میں کمل اور سات ستارے تھے۔ اس کے بعد ہوم رول تحریک کے دوران ڈاکٹر اینی بیسنٹ اور لوک مانیہ تلک نے بھی پرچم کشائی کی جس میں پانچ سرخ اور چار ہرے رنگ کی پٹیاں تھیں، اوپر سات ستارے تھے اور بائیں گوشے میں یونین جیک تھا۔ دوسرے گوشے میں سفید ہلال اور ستارے کا نشان تھا۔ اس کے بعد 1921 میں وجے واڑہ کے کچھ نوجوانوں نے ایک پرچم تیار کیا جو پہلے کے پرچموں سے ذرا الگ تھا۔ اس میں صرف لال اور ہرے رنگ لگائے گئے تھے جو ہندو مسلم کی نمائندگی کررہے تھے۔ گاندھی جی نے اس میں سفید رنگ کو جوڑنے کی بات کی تاکہ تمام طبقات کی نمائندگی ہوسکے۔ اس کے بعد پنگالی وینکیا نے ہندوستان کے قومی پرچم کا ایک نقشہ تیار کیا جس میں چرخا کو بھی شامل کیا گیا تھا لیکن یہ پرچم انڈین نیشنل کانگریس کا نشان تھا اسی لیے اس کو بعد میں تبدیل کیا گیا۔ آج جو قومی پرچم لہرایا جاتا ہے اس کے بارے میں ایک مورخ Trevor Royle نے اپنی کتاب The Last Days of the Raj میں لکھا ہے کہ اس کا ڈیزائن حیدرآباد کی ثریا طیب جی نے تیار کیا تھا جو کہ بدرالدین طیب جی کی شریک حیات تھیں اور یہی نئی تحقیق Capt L. Panduranga نے بھی پیش کی ہے جنھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس حیدرآبادی خاتون نے ہی قومی پرچم کا ڈیزائن تیار کیا تھا۔ اس پرچم میں تین رنگ ہیں: زعفرانی، سفید اور سبز۔ سفید پٹی کے درمیان اشوک چکر ہے جس میں چوبیس خانے ہیں۔ پہلے اس پرچم میں چرخہ تھا جس کی جگہ اشوک چکر کو شامل کیا گیا تھا کیونکہ چرخا ایک خاص پارٹی کا نشان تھا۔

Trevor Royle کے مطابق نہرو جی کی کار پر جو ترنگا لگا ہوا تھا وہ ثریا کا بنایا ہوا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ہمارے ملک کا قومی پرچم ثریا طیب جی نے تیار کیا تھا۔ آج انھیں لوگ بھول چکے ہیں لیکن تاریخ اس بات کو فراموش نہیں کرسکتی کہ ایک خاتون نے ہمارے ملک کو ایک قومی پرچم عطا کیا جس پر ہم اپنی جان قربان کرتے ہیں، جس کی عظمت کو ہم ہمیشہ سلام کرتے ہیں۔ یومِ آزادی، یومِ جمہوریہ اور دیگر تقریبات کے موقعے پر ہم اس ترنگے کو لہراتے ہیں، سلامی دیتے ہیں اور پورا ہندوستان اس قومی پرچم کو سلام کرتا ہے۔ یہ قومی پرچم ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اسی کے ذریعے ہم اپنی ایک تہذیبی اور ثقافتی شناخت کو پوری دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ ترنگا ہماری عظمت اور استحکام کا استعارہ ہے اور یہی ترنگا ہے جو ہندوستان کے تمام طبقات کو ایک ڈور میں باندھے رکھتا ہے۔ یہ صرف قومی پرچم نہیں بلکہ ہماری یکجہتی، اتحاد، یگانگت، رواداری اور رنگارنگی کا نشان ہے۔

■■■

Shafquat Jahan
C-159, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

بلال احمد میر

مسلم خواتین اور تحریک آزادی

1857 تا 1947

ہندوستانیوں کے برطانوی تسلط سے آزاد ہونے کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب عوام میں خود غلامی کی ذلتوں کا احساس پیدا ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت انھیں غلام نہیں بنا سکتی۔ غلامی کے طوق و سلاسل کو اتار پھینکنے کے لیے 1857 سے 1947 تک اہل ملک نے جو جدوجہد کی، وہ تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس عرصے میں اہل وطن غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف مسلسل برسرپیکار رہے اور بالآخر انھوں نے وطن عزیز کو غلامی کی ذلت آمیز بندھنوں سے نجات دلا کر ہی چین کی سانس لی۔

ہندوستان اٹھارویں صدی میں برطانیہ کے زیر اقتدار آیا اور ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جن کا وطن ہندوستان سے کئی ہزار میل دور تھا۔ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے ہوئے انگریزوں نے دھیرے دھیرے اپنی طاقت میں اضافہ کر کے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ انھوں نے پہلے اپنے تجارتی مفادات کے بہانے اپنی کوٹھیوں کی قلعہ بندیاں کیں، فوجیں اکٹھا کیں اور پھر اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے ہندوستانیوں کے آپسی اختلافات اور تنازعات کو ہوا دی۔ اس کے بارے میں شجاع الدین فاروقی یوں رقم طراز ہیں:

"رفتہ رفتہ وہ ایک بڑی قوت کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انگریز اپنی شاطرانہ چالوں اور مکاری وحیلہ سازی میں ید طولی رکھتے ہیں اس کے سہارے انھوں نے ہر ہندوستانی دربار میں اپنے ہم نواؤں اور جاسوسوں کی ایک جماعت پیدا کر لی جو ہر موقع پر ملک وقوم سے غداری کر کے محض اپنے معمولی مفادات کے لیے انگریزوں کا ساتھ دیتی تھی۔"

(مضمون بعنوان "ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی" شجاع الدین فاروقی مطبوعہ سہ ماہی "فکر ونظر" علی گڑھ "تحریک آزادی نمبر" اکتوبر تا دسمبر 1985 ص 33)

Rozina Visram اپنی کتاب "women in india and pakistan , the struggle for independence from british rule" میں لکھتی ہے۔

"ابھی تک جتنی بھی تاریخی کتابیں لکھی گئیں ان میں صرف بڑے بڑے قومی رہنماؤں جیسے گاندھی جی، نہرو جی اور محمد علی جناح کے نام جدجہد آزادی میں مقبول ہوئے یا تو ان کے ساتھ ان کی لڑکیاں، بیویاں یا بہنوں کا نام جدوجہد آزادی سے آشنا ہوئے۔ جب کہ عورت ابتداء سے آخر تک مرد کے چلائے ہوئے ہر تحریک سے وابسطہ ہو کر ہر سطح پر اپنا خون وطن کے لیے نچھاور کرتی رہی۔ ان عورتوں نے عدم تشدد اور سلف رول تحریک کی مہم میں بھی خاصا حصہ لیا ہے۔"

Rozina Visram نے women in india and pakistan ,(the struggle for independence from british rule

من موہن کور اپنی کتاب "women in india's freedom struggle" میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

"1857 سے ہی عورت جدوجہد آزادی میں مرد کے شانہ بہ شانہ کام کرتی رہی۔ جنگ آزادی کے میدان میں مرد

لیڈروں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی تھیں۔عورت لیڈران میں بیگم حضرت محل، رانی لکشمی بائی، رام گڑھ کی رانی، رانی تیس بائی، کے نام بڑی اہمیت کا حامل ہیں۔ان میں کچھ عورتیں میدان جنگ میں فوج کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں اور کچھ میدان جنگ میں شہید ہوئیں اور کچھ ہمیشہ کے لیے قید و صعوبتوں کی زنجیروں میں قید ہوگئیں۔"

(من موہن کور، "women in india's freedom struggle"، ص، 34-35)

1857 کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے شجاعت اور بہادری سے زبردست مشکلات کا مقابلہ کرکے انگریزوں کے خلاف جنگی سرگرمیوں کی آگ کو تیز تر کیا ان میں پیشوا باجی راؤ ثانی کے متبنی نانا صاحب اور ان کے بھتیجے راؤ صاحب کے ذاتی پیرو کار تانتیا ٹوپے، عورتوں میں خاص کر بندیل کھنڈ کی رانی لکشمی بائی، بہار کیسری کنور سنگھ، اودھ کی مسلم شیر دل خاتون بیگم حضرت محل اور دیگر مسلم خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہ وہی وقت تھا جب انگریزوں نے جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کو شکست دینے اور ملک پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد انتقامی کاروائیوں کے تحت بے انتہا درندگی بہیمت اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں لوگوں کو سرِ راہ پھانسی پر لٹکا دینا اور دار پر چڑھا دینا عام سی بات ہوگئی تھی، مجاہدوں کو زندہ آگ میں جلا دینا اور توپوں سے باندھ کر اڑا دینا ان کے لیے ایک کھیل بن گیا تھا۔وحشت و درندگی کے اس کھیل کو کچھ شعراء نے بھی اچھی تصویروں میں اتارا ہے۔جس سے اس وقت انگریزوں کے ہاتھوں ہونے والے قتل عام اور ظالمانہ و وحشیانہ مظالم کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچیں ہیں کانٹوں میں جو پتیاں گلاب کی تھیں

(داغ دہلوی)

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے، نہ کفن ہے، نہ رونے والے ہیں

ان حالات نے بنی نوع انسان کے رگ رگ میں خوف بھر دیا۔اور اسی خوف سے آزاد ہونے کے لیے ان لوگوں میں ہمت آگئی۔ 1857 کی جنگ آزادی ایک ایسی عوامی بغاوت تھی جس میں بادشاہ، بیگمات، رجواڑے اور خواص ہی نہیں، عوام بھی برطانوی آمریت سے آخری ٹکر لینے کے لیے کفن بردوش میدان میں اتر آئے تھے۔بہادری کی

ان کہانیوں میں دو کہانیاں دہلی کی "سبز پوش" خاتون اور کانپور کی "عزیزن" کی ہے۔

سبز پوش" عورت کون تھی کہاں رہتی تھی کہا جاتا ہے کہ سبز پوش (بڑھیا) بہادر تھی۔عورت سبز کپڑے پہن کر میدان جنگ میں جاتی۔جو مردوں کا لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر انگریزوں سے لڑتی تھی۔وہ تلوار اور بندوق سے دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دیتی، وہ نوجوانوں کو ایک نعرے سے بلاتی تھی" آؤ چلو خدا نے تمہیں بہشت میں بلایا ہے"۔اس کی جرائت مندی اور ہمت دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا۔آخر کار وہ جولائی 68-1867 میں انگریزی مورچے کے قریب زخمی ہو کر گرفتار ہو کر انبالہ بھیج دی جاتی ہیں۔لفٹنٹ ہڈسن نے ڈپٹی کمشنر انبالہ کو ایک خط 29 جولائی میں لکھا:

"میں تمہارے پاس ایک مسلم بڑھیا کو روانہ کرتا ہوں۔یہ عجیب قسم کی عورت ہے اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی۔اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچے پر حملہ کرتی رہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے۔جس روز گرفتار ہوئی اس دن گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی۔۔۔۔یہ بہت ہی اندیشناک عورت ہیں۔"

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، "ہندوستان کی آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" ص، 47، بحوالہ خورشید مصطفے رضوی، جنگ آزادی، 1857 ص، 187، 188)

قید کے بعد اس عورت پر کیا گزری کسی کو کچھ پتا نہیں بلکہ اس کی بہادری کو دیکھ کر ہڈسن جیسا سفاک انسان دہلی کی اس خاتون کو "ہندوستان کی جون آف آرک" کے نام سے منسوب کرتا ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین کی خاصی بڑی تعداد اپنے انقلابی بھائیوں کے دوش بدوش جدوجہد آزادی میں شریک رہی اور جامِ شہادت نوش کیا۔جنگ آزادی کی تاریخ نے جن چند ایسے ناموں کو محفوظ کر لیا ہے ان میں عزیزن کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے، مادر وطن کی خاطر بھتور کی اس مجاہدہ کی قربانی بے لوث تھی۔اس میں نہ تخت و تاج کی خواہش تھی اور نہ محلوں کے آرام و آرائش کا خیال وہ صرف آزادی وطن کی خاطر ایک غاصب و جابر حکمران سے برسرپیکار رہی تھی۔

1: بیگم حضرت محل: بیگم حضرت محل وہ جس نے انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے بغاوت کا پرچم بلند کیا۔بیگم حضرت محل نواب واجد

علی شاہ کی بیوی تھی۔ یہ واجد علی شاہ کی ان نو طلاق شدہ بیویوں میں ایک بیوی تھی۔

4 فروری 1856 کو جب انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا، کمپنی کی فوج 1806-1837 کے صلح ناموں کو نظر انداز کرتی ہوئی لکھنو میں زبردستی داخل ہوگئی اور معزول واجد علی شاہ کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا تو کچھ عرصے تک اودھ کے عوام سکتے میں آگئے۔ اس کے بعد حضرت محل نے تقریباً دس مہینوں تک اس شہر کی باگ ڈور سنبھالی۔ بیگم حضرت محل نے 1875 میں انگریزوں کو للکارا اور شکست بھی دی تھی۔ وہ پہلی عورت تھی جنھوں نے 1857 میں انگریزوں کو للکار کر شکست دی۔ وہ بہادر عورت تھی۔ امرت لال ناگر لکھتے ہیں:

"بیگم حضرت محل نے بھی رانی لکشمی بائی کی طرح عورتوں کا ایک فوجی گروہ تیار کیا تھا۔ محلوں کی باندیاں ان کی نگرانی میں قواعد کرتی تھیں۔ انھیں عورتوں نے جاسوس عورتوں کا بھی ایک گروہ تیار کیا تھا۔ اس طرح سے آپسی نفاق کے مایوس کن حالات میں بھی ایک ایک فرد کے دل میں بغاوت کا جذبہ تقریباً پونے دو برس اودھ میں برقرار رکھنا بیگم ہی کا کام تھا۔"

(زامرت لال ناگر، غدر کے پھول، ص 260)

انھوں نے انگریزوں سے دس مہینے کی مدت میں ان گنت لڑائیاں لڑیں۔ لارڈ کیننگ کا اصرار تھا کہ لکھنؤ جس قدر جلد ممکن ہو سکے فتح کر لیا جانا ضروری ہے۔ لارڈ کیننگ نے 20 دسمبر کو لکھا کہ "بالفعل فوراً" اودھ کو لے لینا چاہیے اور سب جگہوں سے زیادہ باغی وہاں جمع ہیں۔ اس کام میں اودھ کے خاندان کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں کہ آیا ہم میں یہ قدرت ہے یا نہیں کہ اس پر اپنا تسلط رکھ سکتے ہیں اس کی مثال دہلی کی سی ہے کہ لکھنو کا دوبارہ فتح نہ کرنا ہمارے حق میں ایسا ہی ہے جیسا کہ دہلی سے واپس چلے آنا ہوگا۔ ادھر برطانوی افواج کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ایک زبردست گورکھا فوج بھی سپہ سالار جنگ بہادر کے ماتحت لکھنو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ 25 فروری 1857 حضرت محل خود برجیس قدر کو لے کر میدانِ جنگ میں آئیں۔ اس سے جوش وخروش میں اضافہ تو ہوا مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ 11 مارچ 1858 گورکھا فوج بھی انگریزی لشکر سے آکر مل گئیں اور انگریزی تلواریں لکھنو پر مکمل اقتدار کے لیے بے نیام ہوگئیں۔ اس وقت انھوں نے انگریز فوج سے شکست کھائی۔ بیگم حضرت محل ناکامیوں سے شکستہ ہونا نہیں جانتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس فوج نے ان پر یورش کی تھی تعداد و اہتمام میں انگریزوں نے اتنی بڑی فوج بھی صف آرا نہیں کی تھی۔ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر مورچہ بندی کرتی رہیں۔

حضرت محل نے دس ماہ بڑی دلیری سے انگریزی افواج کا مقابلہ کیا۔ دورانِ جنگ جنرل اوٹرم نے صلح کی کئی شرطیں پیش کیں۔ جنھیں غیور ملکہ بے نیازی سے ٹھکراتی رہی۔ لکھنؤ فتح کے بعد انگریزوں نے حضرت محل کو دشمن نمبر ایک ٹھہرایا۔ آخر کار 16 مارچ انھیں لکھنو کو خیر آباد کہنا پڑا اور آخر غلامی کی زندگی گزارنے سے بہتر انھوں نے نیپال کا راستہ اختیار کیا اور وہیں رہ گئیں جہاں پر حضرت محل کو ہر قسم کی تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ من موہن کور نے اپنی کتاب "women in india,s freedom struggle" میں لکھتی ہیں:

"بیگم حضرت محل 1877 میں ہندوستان واپس آنا چاہتی تھیں مگر انگریزوں نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ بیگم حضرت محل اور ان کے اولاد کو برٹش انڈیا میں آنے کی اجازت ہرگز نہیں ہوگی کیوں کہ یہ عورت بہت چالاک اور بہادر ہے۔"

(من موہن کور، "women in india,s freedom struggle" ص، 40)

آخر کار یہ بہادر مجاہد آزادی 1879 میں اس فانی دنیا سے کوچ کرتی ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ مادر ہند نے طوق غلامی اتار پھینکنے کے بعد اپنی اس جیالی بیٹی کو بھلا دیا اور ان کا نام ماضی کے اوراق میں گمشدہ ہوگیا۔ اس کا نام جنگ آزادی کے پروانوں اور قومی یکجہتی کے متوالوں کی فہرست میں شامل ہوکر نئی نسل کی درسی کتابوں کی زینت نہ بن سکا۔

2: عزیزن: عزیزن بھی جنگ آزادی کی ایک بہادر عورت ہے۔ عزیزن 1832 میں لکھنو میں پیدا ہوئی۔ عزیزن مشہور امراؤ جان ادا کے

یہاں سارنگی محل میں رہی۔عزیزن کو اپنے حکمران ناناصاحب کی وفاداری پر ناز تھا جس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔وہ انگریزی سامراج کی دشمن تھی۔ اس لیے زندگی کی آخری سانس تک اس کے سامنے سرنہیں جھکایا۔ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ''میں رقم طراز ہیں:

> ''4 جون 1857 کا نپورانقلابیوں کا پڑاؤ تھا۔سر جیورج ٹرولین کے مطابق 7 جون 1857 کو ناناصاحب پیشوا کی طرف سے ہندی اور اردو دونوں میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندو مسلمانوں سے مشترکہ اپیل کی گئی تھی، کہ وہ اپنے ملک و مذہب کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لیے متحد ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی ہوں۔فوجی بھرتی کا اعلان سنتے ہی یہ مجاہدہ گھر بار چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت میدان جنگ میں کود پڑی۔ شمس الدین کے تعاون سے اس نے عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج منظم کی وہ گھر گھر جاتی ،عورتوں کو گھڑ سواری اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتی تھی۔ ۔وہ خود فوجی دستے کی مخصوص وردی میں ملبوس، کاندھوں پر تمغے سجے ہوئے سوار بے خوف وخطر ادھر سے ادھر گھومتی تھی۔''

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب'' ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ''ص،49)

1857 کے انقلاب میں جب کانپور میں باغیوں کو شکست ہوئی۔ کرنل ویلم نے جب باغیوں کی فہرست تیار کی تو عزیزن کا نام سرفہرست تھا۔ہندستانیوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائی شروع ہوئی جب عزیزن کو بحیثیت قیدی، جنرل ہیوک کے سامنے پیش کی کیا گیا تو اس حسین مورت کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔اس کے لیے یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ پھول جیسی یہ لڑکی باغی ہو سکتی ہے کہا جاتا ہے کہ جنرل ہیونگ نے اس لڑکی کو بچانے کی کوشش کی تھی اس لیے عزیزن سے کہا کرتا تھا کہ آپ اپنا جرم کا اقرار کرلو اور رحم کی بھیک مانگ لو تو آپ رہائی حاصل کر سکتی ہے۔مگر عزیزن جنگ آزادی کی ایسی بیٹی تھی جس نے یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس رعایت کو حقارت سے ٹھکرادیا۔کیوں کہ وہ جانتی تھی اس کا یہ قدم اس کے بقیہ انقلابی ساتھیوں کے حوصلے پست کر دے گا۔جنرل ہیوک نے ایک بار اور پوچھا جس پر ان کا ایک ہی جواب تھا۔''ہر ممکن طریقے سے برطانوی حکومت کا خاتمہ'' پھر اس کے بعد ہیولاک نے مجبوراً سپاہیوں کو فائر کرنے کا حکم دیا۔پہلے ہی فائر پر اس نے نعرہ بلند کیا'' ناناصاحب زندہ آباد'' تو پھر انگریزی فوج کی گولیوں سے عزیزن کو چھلنی کیا گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلی گئی۔اور بہادری کے نام کو پیچھے چھوڑ گئی۔

3: اصغری بیگم: اصغری بیگم کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔اصغری بیگم کی پیدائش 5 جولائی 1811 میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اترپردیش میں ہوئی۔وہ تھانہ بھون کے باغی رہنما قاضی عبدالرحیم کی والدہ تھیں۔1857 کی جنگ آزای میں برطانوی افواج کی مزاحمت کے جرم میں پکڑی گئیں اور زندہ جلادی گئیں۔

4: حبیبہ: حبیبہ کا تعلق بھی مظفر نگر سے ہی تھا۔وہ 1833 میں پیدا ہوئیں اور 1857 کی جنگ میں انہوں نے برطانوی افواج کو للکارا اور ان کے خلاف سازشیں بھی کیں مگر آخر کار وہ دوسرے لوگوں کی طرح ظالم برطانوی افواج کے ہاتھوں کا شکار ہوئی۔وہ بنیادی طور پر ایک مسلم گوجر خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ برطانوی افواج کی مزاحمت کی پاداش میں گرفتار ہوئی اور 1857 میں ان کو پھانسی دی گئی۔

5: رحیمی: رحیمی کا تعلق بھی اترپردیش کے ڈسٹرک مظفر نگر کے ایک دور دراز گاؤں سے تھا۔ اس بہادر خاتون کا تعلق ایک مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔انہوں نے بھی باقی بہادر عورتوں کی طرح برطانوی افواج سے کئی بار مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔اس ہنگامے میں شاید ہی کوئی ایسا خاندان بچا ہوگا جس کا کوئی فرد انگریزوں کے شعلہ انتقام کا شکار نہ ہوا ہو۔ ہندوستان کی پہلی جنگ عظیم میں رحیمی نے بھی بھرپور حصہ لیا۔برطانوی فوجوں سے مزاحمت کی۔ایک طرف انقلابیوں کی خاطر'' تیغ موت'' پھانسی اور دار سے کی جارہی تھی تو دوسری طرف بہت بڑی تعداد میں حریت پسندوں کو جلاوطنی، حبس دوام بعبور دریائے شور اور اسیری کے آلام و مصائب سے نوازا جا رہا تھا۔اسی اثناء میں رحیمی کو بھی مزاحمت کی پاداش میں ان کے ہمراہ گیارہ عورتوں کو ایک ساتھ پھانسی دی گئی، کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر اس وقت 25 سال کی تھی۔

غدر کی بغاوت اور پھر اس کے بعد برطانوی افواج کے ظلم و جبر کی ایک ایسی بھیانک تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آکر رک جاتی ہے۔جس سے انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔کہا جاتا ہے اس دور میں تقریباً دو سو پچپن عورتیں برطانوی فوج سے لڑتی ہوئی شہید ہوئیں اور گیارہ عورتوں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

ہندوستان کی تاریخ میں تحریک خلافت کی معنویت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔تحریک خلافت کا لفظ بادی النظر میں خاص مذہبی رنگ لیے

ہوئے ہے، لیکن اس کے قیام اور اس کے ساتھ مل کر چلنے والے ملک کے مختلف ملی و مذہبی رہنماؤں، قائدین کی کوششوں اور پیہم مساعی کو دیکھا جائے اور ان حالات کا مطالعہ ہو جائے۔ جن میں اس کا قیام عمل میں آیا تو یہ بات بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ تحریک ملک سے بیرونی تسلط کے خاتمے اور اپنے ماضی کی بازیافت کی تحریک تھی، جس نے برصغیر میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا تیار کی اور انہیں یہ باور کرایا کہ برطانوی سامراج تمہیں فریب کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔

6: بی اماں: بی اماں کا اصلی نام آبادی بانو تھا وہ امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی تھیں۔ ان کی پیدائش اور عمر کے متعلق علی محمد لکھتے ہیں کہ وہ تقریباً 1852 میں پیدا ہوئی اور عمر تقریباً 72 سال تھی۔ وہ 27 سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ" میں لکھا ہے کہ سر امنی آئر مدراس ہوم رول لیگ کے نام اپنے 4 اگست 1917 کے خط میں انھوں نے خود تحریر کیا ہے کہ "میرے خاوند کی اچانک اور قبل از وقت موت نے مجھے 27 سال کی عمر میں بیوہ بنادیا۔ بی اماں کے چھ بچے تھے جن میں علی محمد سب سے چھوٹا تھا۔ علی محمد محض دو برس کے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی بی اماں نے ہی کی۔ یہ علی برادران کی والدہ تھیں۔ تحریک خلافت میں ان کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ ان کی ذہانت اور باطنی صلاحیتوں کے بارے میں علی محمد جوہر یوں رقم طراز ہیں:

> "اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ اگر چہ عملی طور پر وہ بالکل ان پڑھ تھیں، لیکن میرا کسی ایسے شخص سے واسطہ نہیں پڑا جو ان سے زیادہ عقل مند اور خدا پرست ہو۔ انھوں نے شادی کے بعد اردو پڑھی اور خاندان کی تمام تر رجعت پسندی کے باوجود انھوں نے اپنے شوہر کی وفات سے قبل ٹوٹی پھوٹی اردو سیکھ لی تھی۔ پھر جب وہ تحریک خلافت میں شریک ہوئیں تو انھیں باقاعدہ اردو آتی تھی اور وہ خلافت کے جلسوں میں تقریریں کیا کرتی تھیں۔"

(ڈاکٹر منور حسین کمال "تحریک خلافت اور جدوجہد آزادی" ص، 178)

بی اماں عوامی جلسوں میں زور و شور سے تقاریر کر رہی تھیں اور خلافت اور قومی آزادی کے حصول کی خاطر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی ان تھک کوشش میں مصروف تھیں۔ ان کی سیاسی مصروفیت کے بارے میں تحریک خلافت کے ایام میں سہارن پور کے ایک گمنام شاعر منشی نور محمد نے چھ بندوں پر مشتمل ایک نظم "صدائے خاتون" تحریر کی جس کو قادر حسین نے بی اماں کا پیام فرزند کے نام سے مدراس میں طبع کیا (لطیف حسین آزاد، آواز دہلی یکم اکتوبر 1985 ص، 10)

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تم تو جاتے ہو دو دو برس کو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پہ چڑھنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دینا

30 دسمبر 1921 کو احمد آباد میں کل ہند زنانہ کانفرنس بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شرکاء اجلاس میں شریمتی کستور با گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی انو سیابائی، شریمتی چودھرائن، شریمتی سرلا دیوی، محترمہ امجدی بیگم، محمد علی، محترمہ شمس النساء بیگم، محترمہ بیگم، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محترمہ نشاط النساء بیگم، حسرت موہانی، محترمہ بیگم خواجہ اور محترمہ بیگم سیف الدین کچلو کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں دوسری خواتین نے بھی کانفرنس میں حصہ لیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین بھی تحریک آزادی میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتی رہی ہیں۔ چند مقرر خواتین کے بعد بی اماں نے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔ "پیاری بہنو، ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط و استوار رہیں وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو وہ کبھی بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا وفادار نہیں رہ سکتا اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مابین اتحاد اور اتفاق پیدا کریں تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ پر امن و باعزت زندگی گزار سکتے ہیں۔

اسی خطبے میں آگے بی اماں کہتی ہیں، بہنو! خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ہندوستان کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہوگئی ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو حب الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔

گاندھی جی بی اماں کی آزادی کے جذبے کے بارے میں ینگ انڈیا میں یوں رقم طراز ہیں:

''اگرچہ سن رسیدہ تھیں لیکن ان میں نوجوانوں جیسی طاقت تھی۔ان کا خیال تھا کہ خلافت اور سوراجیہ کے حصول کے لیے کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی۔اس لیے انھوں نے اتحاد کے لیے زبردست کوششیں کیں جوان کے نزدیک جزوایمان تھیں۔''

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ'' ص،103،104)

علی برادران کی رہائی کے بعد بھی بی اماں کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں۔مولانا محمد علی جوہر 11 نومبر 1922 کے ہمدرد میں ان کے عزم وہمت اور غیر معمولی جدوجہد کے سلسلے میں لکھا ہے:

''بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ ہم لوگ آگئے ہیں اور پوری ہمت ومصروفیت کے ساتھ کام کریں گے۔آپ کو اب دن رات کے سفر اور دورہ کی ضرورت نہیں،آپ آرام کیجیے اور مطمئن رہیے کہ ہم کوئی دقیقہ ملک ومذہب کی خدمت گزاری کا اٹھا نہ رکھیں گے،مگر اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں تو مجھ پر شک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک وقوم کی خدمت نہ کرسکے گی۔یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ گھر پر پڑی رہوں اور اپنے ملک ومذہب کی کوئی خدمت نہ کروں۔''

(تحریک خلافت اور جدجہد آزادی،ڈاکٹر منور حسن کمال،ص،189)

عمر عزیز کے آخری لمحات میں وہ بغرض علاج دہلی آئیں اور اس کے بعد مسوری اور پھر رام پور چلی گئیں۔وہاں جاکر طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی۔تو قضا ہر حال آتی ہے اس طرح یہ باحوصلہ خاتون 13,12/ نومبر 1924 کی درمیانی شب میں اس جہاں سے چل بسی۔مسز اینی بیسنٹ نے انھیں اس طرح تعزیت پیش کی ہے:

''میں خراج عقیدت پیش کرنے میں خود کو دوسروں کے ساتھ شریک کرتی ہوں،اس شیر دل اور انتہائی قابل احترام خاتون کے تئیں جو کسی خطرے سے خوف زدہ نہیں ہوئی اور جس نے اس دھرتی پر کسی چیز کو اپنے عقیدہ پر فوقیت نہیں دی۔ایسی روحیں دوسروں کو باوقار بناتیں اور مثال پیش کرتی ہیں۔وہ آزادی کی راہوں کو منور کرتی ہیں اور ہموار بناتی ہیں،اپنے خون بہتے ہوئے پاؤں سے جس پر قومیں چلتی ہیں؟ انھیں ابدی روشنی میسر ہو۔''

(تحریک خلافت اور جدجہد آزادی،ڈاکٹر منور حسن کمال،ص،189۔190)

7: امجدی بیگم: امجدی بیگم 1885 میں رام پور کے ایک مسلم اور پرہیزگار گھرانے میں پیدا ہوئی۔ان کے والد رام پور حکومت میں ایک بڑے آفیسر تھے۔بچپن میں امی کی وفات ہوئی جس سے آپ اپنی نانی کے پاس رہیں اور ساری تعلیم وتربیت ہوئی۔مذہب سے ان کو خاصی دلچسپی تھی۔دینی اور مذہبی تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد مذہبی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا۔سترہ سال کی عمر میں 1902 میں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔شادی کے فوراً بعد سرتاپا اپنے شوہر کے رنگ میں رنگ گئیں۔وہ ہمیشہ اپنے شوہر کے سیاسی مسلک سے متفق تھی۔وہ مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ اکثر بیشتر سیاسی میٹنگوں اور خلافت کانفرنس اور دیگر اجلاسوں میں بھی شریک رہیں۔مہاتما گاندھی اپنے اخبار ینگ انڈیا میں امجدی بیگم کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''کانگرس کی ستیہ گرہ تحریک اور خلافت فنڈ کے لیے بی اماں اور امجدی بیگم نے دوسروں سے کروڑوں روپے چندہ جمع کیا۔''

(تحریک خلافت اور جدجہد آزادی،ڈاکٹر منور حسن کمال،ص،190۔192)

مہاتما گاندھی کو عوام سے روشناس کرانے اور ان کے دور دراز علاقوں کے سفر یعنی،بہار،آسام،بنگال کے اخراجات کا بار اٹھانے میں تحریک خلافت کے رضا کاروں کے ساتھ امجدی بیگم اور بی اماں نے چالیس لاکھ روپے جمع کرکے گاندھی جی کو دیے تھے۔جس کی وجہ سے تحریک آزادی ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی تھی۔آل انڈیا مسلم لیگ کی پہلی کانفرنس امجدی بیگم کے زیر نگراں 1937 میں لکھنو میں ہوئی۔پٹنہ کے سالانہ اجلاس میں جب مسلم لیگ نے عورتوں کے لیے ایک شاخ کھولی تب سب سے پہلے امجدی بیگم کو اس شاخ کا صدر چن لیا گیا۔

انہوں نے علی گڑھ میں کھادی کے تحت عورتوں کی بہبودی کے لیے اور آزادی کی آواز کو کونے کونے تک پہنچانے کے لیے ایک ''روزنامہ ہند'' نکالا۔جس میں اعلیٰ اور معیاری مضامین ہوتے تھے جس سے سماج غلامی کی زنجیروں کو توڑنے میں کامیاب ہوتا گیا۔

8: نشاط النساء بیگم: آزادی حریت کے متوالوں میں اولوالعزمی اور جاں بازی کی روح پھونکنے والی خواتین میں نشاط النساء بیگم (بیگم حسرت موہانی) کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔نشاط النساء بیگم غالباً 1885 میں موہان ضلع اناؤ کے ایک معزز سادات خاندان میں پیدا ہوئیں۔انھوں نے مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو،فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی شادی سے پہلے وہ اپنے قصبے کی لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ان کا سیاست اور تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا تب ممکن ہوا جب 1908 میں مجاہد

آزادی حسرت موہانی کو انگریزوں نے گرفتار کرلیا یہ پہلی گرفتاری ہی نشاط النساء کی سیاسی سرگرمیوں کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی اس کے بعد بیگم حسرت موہانی آزادی تحریک میں شامل ہوگئیں ۔بیگم حسرت موہانی نے جدوجہد آزادی میں شوہر کے ساتھ شانہ بہ شانہ تحریک میں حصہ لیا اور اخلاقی جرائت اور وطن سے محبت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

بیگم حسرت موہانی نے زندگی کے ہر موڑ پر حسرت موہانی کا ساتھ دیا۔انہوں نے خلافت اسٹور کو خواتین میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔انہوں نے بریلی میں خواتین کی ایک میٹنگ طلب کی اور انھیں سودیشی تحریک میں حصہ لینے پر آمادہ کیا اس موقع پر سینکڑوں خواتین نے سودیشی کا عہد لیا خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں میں وہ برابر شریک ہوئیں ۔1921 میں احمد آباد میں منعقد کل ہند خواتین کانفرنس کے اجلاس میں جس کی صدارت بی اماں نے کی، اس میں بھی وہ شریک تھیں۔

وہ آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں اور سیاسی جلسوں میں ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔بیگم حسرت موہانی کے عزم و استقلال ان کی سیاسی سرگرمیوں اور شوہر پرستی سے اس عہد کے بڑے بڑے سیاسی رہنما متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر نے نشاط النساء بیگم کو اپنے ایک خط میں لکھا:

>''بھائی صاحب سے کہہ دیجیے کہ برادرم باوجود عزم و استقلال کے تمہارا مرتبہ ایک کمزور اور ناتواں عورت سے کم ہی رہا ہوگا۔جس کے سینے میں تم سے بڑا دل موجود ہے اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت اور استقلال کا وہ سبق دیا ہے جو تم آزاد ہو کر بھی نہ دے سکتے تھے اور جو شاید قید ہو کر بھی نہ کیا۔''

دسمبر 1922 میں کانگرس کے ''گیا'' اجلاس کے موقع پر گاندھی جی جیل میں تھے ۔ان کی عدم موجودگی تحریک موالات کی مخالفت اور کونسلوں میں شرکت کے سوال پر زوردار بحثیں ہوئیں حسرت بھی ان دنوں قید میں تھے۔نشاط النساء بیگم نے نہ صرف اجلاس میں شرکت کی بلکہ ترک موالات کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ ''مکمل آزادی کے جو لوگ علمبردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک کرنے کا تصور نہیں کر سکتے۔البتہ جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا پسند کرتے ہیں وہ کونسلوں میں جا کر آئینی اصطلاحات کی قسط وصول کر سکتے ہیں ۔انہوں نے کہا کہ احمد آباد میں (کانگریس کے موقع پر حسرت کی پیش کردہ) مکمل آزادی کی قرارداد کی مخالفت کرنے کی جو غلطی گاندھی جی نے کی تھی ، آج داخلہ کونسل کے حامیوں کا زور اسی کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔(انڈین اینول رجسٹر 1923-1922 جلد اول ص، 91)

ان کی سیاسی سرگرمیوں اور جذبہ آزادی کے بارے میں ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے اپنی کتاب'' ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ میں یوں رقم طراز ہیں۔

>''نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیاں محض حسرت کے مقدمات کی پیروی تک ہی محدود نہ تھیں۔حسرت کے ساتھ ہر سیاسی اجلاس میں ان کی شرکت اور اس کے لیے بے سرو سامانی کی حالت میں بھی دوردراز کے سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے انتھک جدوجہد،کل ہند زنانہ کانفرنس میں شرکت، ہم خیال سیاسی رہنماؤں سے خط وکتابت ،قومی اخبارات سے مسلسل ربط اور کل ہند زنانہ وفد میں مسز بیسنٹ وسروجنی نائیڈو وغیرہ کے ساتھ ان کی شمولیت جو قومی سطح پر ان کی منفرد حیثیت کی واضح نشاندہی ہے۔''

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب'' ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ''ص، 135)

یہ تاثر کہ نشاط النساء بیگم کی تمام تر سیاسی سرگرمیوں کے پس پشت محض ایک جذبہ رفاقت تھا۔جدوجہد آزادی میں ان کی عظیم الشان خدمات کا مناسب اعتراف نہ ہوگا۔اس میں شک نہیں کہ ان کے سیاسی شعور کا آغاز اور ارتقاء حسرت کی معیت میں ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ارتقاء کے مراحل جس تیزی سے انھوں نے طے کیے اس میں بڑا دخل ان کی اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھی ہے عملی زندگی میں جوں جوں سامراجی آمریت واستبداد سے ٹکراؤ بڑھتا گیا اس کے استحصال کی حکمت عملی کے گھناؤنے نقوش بھی واضح ہوتے چلے گئے اور سیاسی شعور میں بھی پختگی کے ساتھ ساتھ آزادی کامل کا یقین بھی ایمان کی شکل اختیار کر گیا جس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی کے لیے ہمہ جہت تیار رہتی تھی۔

9: سعادت بانو کچلو: جنگ آزادی کی خوشبو کو شعروں میں پرونے والی مجاہدہ اور شاعرہ سعادت بانو کچلو 10 جنوری 1893 کو پنجاب کے امرتسر کے ایک متمول اور معزز علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے بہت جلد فارسی اور اردو پر قدرت حاصل کی۔ انھوں نے سماجی برائیوں، تہذیب نسواں اور خواتین کے مسائل پر بہت سے مضامین قلم بند کیے۔ان کا ایک مضمون حریت نسواں'' تہذیب نسواں'' میں کئی قسطوں میں

شائع ہوا۔انھوں نے اردو فارسی کے کلاسیکی شعرا کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور شاعری کے سبزہ زار پر ایک الگ راہ اختراع کی۔سعادت بانو کی اکثر نظمیں قومیت اور حب وطن سے سرشار دل کی آواز ہیں۔ان کی ایک نظم ''تاروں سے گفتگو'' نے حب وطن اور آزادی کی خوشبو پورے فضا کو معطر کیا ہے:

تم سے غرض ہے مجھ کو نہ کچھ آسمان سے
مطلب ہے اپنے ملک سے ہندوستان سے
کیا وہ بھی دن خدا مجھ کو دکھائے گا
ہندوستان تمہاری طرح جگمائے گا
اہل زمانہ دیکھے گا ہندوستان کو
اس کی چمک لبھائے گی سارے جہان کو
پیارے وطن کے نام پہ جاؤں نثار میں
اجڑے چمن میں دیکھوں الٰہی بہار میں

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''سعادت بانو کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی ان کا دل جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھا۔ایک مسلم لڑکی، زمانہ دوشیزگی، پردے کی قیود اور قوم پرستی ایسے جذبات واحساسات کی خزینہ داری آج کے زمانے میں کوئی اہم بات نہ ہو لیکن اس زمانے کے تناظر میں یقیناً حیران کن اور قابل ستائش ہیں۔''

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب'' ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ''ص، 154)

30 اکتوبر 1915 کو فخر قوم ڈاکٹر سیف الدین کچلو بیرسٹر نے انھیں سعادت بانو کو شریک حیات منتخب کیا۔وہ ایک عظیم محب وطن اور شعلہ بیان مقرر تھے۔انہوں نے وکالت چھوڑ کر خود کو کانگریس اور خلافت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ان کو بنگال میں ایک تقریر کی پاداش میں نکال دیا گیا۔سعادت بانو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کے سرگرم کارکنان میں سے تھیں۔شاید ہی کوئی بڑا سیاسی جلسہ ہو، جس میں سعادت بانو نے شرکت نہ کی ہو۔خصوصاً زنانہ جلسوں میں وہ پرجوش تقریریں کیا کرتی تھیں۔وہ آل انڈیا کانگریس کی سرگرم رکن تھیں۔

سعادت بانو کچلو نے سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شوہر کے دوش بدوش حصہ لیا 22-1920 کی دم تحریک میں ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے دوران انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ سوراج آشرم کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''جنگ آزادی میں شریک نوجوان سعادت بانو کی توجہ کا خصوصی مرکز تھے، ان کی ہر ممکن امداد اور اپنی ماں جیسی ممتا کے سبب وہ بلا تفریق مذہب وملت ان سبھی نوجوانوں کی ''آپاجی'' بن گئی تھیں۔وہ ایک سچی مسلمان خاتون تھیں۔''

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب'' ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ،ص، 158)

ملک آزاد ہوا اور پھر تقسیم بھی ہوا۔اس تقسیم میں کچلو خاندان بھی برباد ہوا اور لٹ گیا۔وہ دہلی آئے اور یہیں پر ڈاکٹر کچلو کی موت ہوئی۔ڈاکٹر کچلو کی موت کے بعد سارا خاندان منتشر ہو گیا۔روشن خیال ادیبہ شاعرہ اور وسیع تناظر میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھنے والی شخصیت جب بیمار ہوئیں تو آزاد ہندوستان میں بغیر دوا وعلاج کے 18 اگست 1970 کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔

10: زلیخا بیگم: بیگم زلیخا 1894 میں پیدا ہوئی۔ان کی انتہائی کم عمر میں مولانا ابوالکلام آزاد سے شادی ہوئی۔اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر 12 سال تھی۔اس طرح وہ بچپن سے ہی مولانا آزاد کے رنگ میں رنگی تھیں اور عہد جوانی میں رنگ پوری طرح غالب آ گیا تھا۔زلیخا بیگم کی اگرچہ بہت کم خدمات ہیں مگر تحریک خلافت کے سلسلے میں 1921 کو جب مولانا آزاد کو سیاسی الزامات لگا کر جیل میں قید کر دیا گیا تو بیگم زلیخا نے اس وقت تحریک خلافت کے اجلاس اور اس کے دیگر امور بھی انجام دیئے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زلیخا بیگم نے اس طرف بھی توجہ دی اور تحریک خلافت سے متعلق لوگوں میں آمادگی پیدا کی۔زلیخا بیگم ایک باوفا عورت تھیں جس نے مرد مجاہد آزادی ابوالکلام آزاد کا آخری دم تک آزادی کے بارے میں ساتھ دیا۔ڈاکٹر منور حسین کمال ان کی وفاداری کے بارے میں اپنی کتاب 'تحریک خلافت اور جدوجہد آزادی' میں یوں رقم طراز ہیں:

''وہ بڑی خدمت گزار اور وفا شعار خاتون تھیں۔اس سلسلے کا ایک واقعہ حمیدہ سلطان نے ایک جگہ نقل کیا ہے کہ ایک دن وہ اپنی والدہ کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں پہنچیں تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔یہ دیکھ کر والدہ حمیدہ سلطان نے ان سے مسکرا کر کہا کیا رت جگا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔وہ ہنس کر بولیں آپ کو بنانے کی عادت ہے۔آج کل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں،

جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں، اور میں آرام کرتی رہوں۔"

(تحریک خلافت اور جدجہد آزادی، ڈاکٹر منور حسن کمال، ص، 193)

مولانا آزاد کو احمد نگر جیل میں قید کردیا گیا تو زلیخا بیگم لگاتار ان سے خط و کتابت کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی بیماری کا شائبہ تک نہیں کیا۔ مولانا کو ان کا ایک خط ملا جس میں ادھر ادھر کی باتیں تھیں، لیکن اپنی بیماری کا انہوں نے ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ مولانا کو اخبارات سے ان کی شدید بیماری کی خبریں ملنا شروع ہوئیں۔ آخر خطرناک صورت حال کا تار ملا۔ حکومت بمبئی کے ایما پر جیل سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے پیرول پر رہائی کی بات کی۔ یہاں جواہر لال نہرو نے بھی اسرار کیا تھا مگر ابوالکلام آزاد نہیں مانے اور ان کی انانیت غالب آگئی اپنی جان سے زیادہ چاہنے والی بیوی کی آرزو پوری نہ کرسکے ادھر زلیخا کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی، بالا آخر 19 اپریل 1943 کو زلیخا بیگم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز شوہر کے دیدار کی حسرت لیے اس فانی دنیا سے چل بسی۔ پورے ملک میں زلیخا بیگم کی المناک موت پر ماتم کیا گیا۔

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب میں ان کی وفات کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"رہائی کے بعد جب ہاوڑا اسٹیشن سے وہ کار میں روانہ ہوئے تو مولانا آزاد کو وہ زمانہ یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھی۔ اب میں تین سال گھر بعد واپس آرہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔"

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ، 171)

اپنی سب سے قیمتی متاع بھی قوم پر نچھاور کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کے قدم آزادی کی منزل تک بڑھتے رہے۔ آزادی کی اس منزل کو پالینے میں زلیخا بیگم جیسے کتنے ہی پیکر مہر و وفا و خلوص و ایثار، مادر وطن پر خاموشی سے نثار ہوگئے۔

11: بیگم خورشید خواجہ: خورشید بیگم ایک پر جوش مقرر اور مصنفہ تھیں۔ وہ شہر حیدر آباد میں 1896 میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد چیف جسٹس تھے۔ ان کی تعلیم بھی گھر پر ہی ہوئی۔ وہ سروجنی نائیڈو کے افکار و خیالات سے خصوصی طور پر متاثر ہوئی۔ ان کی شادی بھی ایک مرد مجاہد آزادی خواجہ غلام عبدالمجید سے ہوئی جو علی گڑھ میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد انہوں نے شوہر کے ساتھ ہر چھوٹے بڑے سیاسی کام میں حصہ لینا شروع کیا۔ خورشید بیگم 1920 میں انڈین نیشنل کانگرس کی ممبر بنیں اور تا حیات اسے برقرار رکھا۔ 1921 میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں یوپی کی نمائندہ تھیں۔ ان کے ساتھ یوپی سے دوسری خواتین بیگم حسرت موہانی، بیگم محمد علی، شریمتی کملا نہرو اور شریمتی سروپ رانی بھی تھیں۔

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ان کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"انہوں نے علی گڑھ میں ایک کھادی بھنڈار بھی قائم کیا اور 1921 میں علی گڑھ سے ہی "ہند" نام کا ایک ماہانہ جریدہ بھی شروع کیا۔ جس کی ادارت کے فرائض بھی انہوں نے خود ہی انجام دیئے۔ اپنے ایک پوسٹ کارڈ میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا کہ وہ انھیں اردو میں اپنا سب سے پہلا خط لکھ رہے ہیں۔"

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ، ص، 161)

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں اس قوم پرست جوڑے کی خدمات جتنی ہیں شاید کسی اور کو ان کے مدمقابل کھڑا نہیں کر سکتے ہیں۔ جب ان کے شوہر کو حکومت گرفتار کر لیتی ہے۔ تب وہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کے انتظام سے متعلق ان کے سبھی کاموں کو خود انجام دیتی ہے۔ بیگم خورشید تا حیات کانگریس کے نصب العین سے وابستہ رہیں 1930 میں انھوں نے الہ آباد میں حمیدیہ گرلس سکنڈری اسکول قائم کیا جو بعد میں ہائی اسکول اور پھر انٹر کالج بنا اور آج ڈگری کالج ہے۔ بیگم خورشید آخر کار اس فانی دنیا سے 1981 کو کوچ کر گئے۔

12: ز، خ، ش، زاہدہ خاتون شروانیہ: زاہدہ خاتون کی ولادت علی گڑھ کے قریب قلعہ بھیکم پور میں 8 دسمبر میں ہوئی۔ وہ نواب مزمل حسین خان شیروانی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی صاحبزادی تھیں۔

گھریلو ماحول کی وجہ سے وہ اپنے شعری ذوق کے بارے میں گھر والوں کو کبھی نہیں بتاتی تھیں کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ موجودہ گھریلو ماحول اس کے لیے سازگار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ز، خ، ش کے تخلص نام سے ان کی نظمیں مشہور ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہیں اور مشاہیر سے داد تحسین لیتی رہیں۔

حضرت اکبر الہ آبادی نے جن سے وہ خاص عقیدت رکھتی تھیں خواجہ حسن نظامی کے مکان پر ان کے کلام کے متعلق سے کہا تھا۔ "اگر یہ اشعار کسی

خاتون نے کہے ہیں تو مردوں کو دعویٰ شاعری سے ہاتھ اٹھالینا چاہیے۔"

(حیات، ز،خ،ش متذکرہ ص،77)

زاہدہ خاتون اصلاح معاشرت "خصوصاً" آزادی نسواں کی خصوصی طبلگار تھیں۔انہوں نے عورتوں کو اپنے حقوق طلب کرنے اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی بڑی پر جوش تلقین کی ہے۔ ہندوستانی اسلامی معاشرہ میں عورت کی بے بسی کا ایک واضح خاکہ ان کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو

سراپا جرم ہوں کس کس خطا کا نام لوں نزہت
مسلماں ہوں صداقت کیش ہوں ہندی ہوں عورت ہوں

(فردوس تخیل ص، 126)

بیسویں صدی کا دوسرا دہا فرسودہ جاگیردرانہ نظام کسی خاتون کو آہ کھینچنے کی اجازت بھلا کب دے سکتا تھا، زاہدہ خاتون بھی۔ "زمانے کی ہوا" لگ جانے کے طنز کا شکار ہوئیں ذہین مجاہدہ بھی ہتھیار ڈالنے والی شخصیت نہیں تھیں۔انھوں نے اس طنز کا جرائت مندانہ جواب دیا۔

نہ ہوتا گر اثر ہم پر زمانے کا تو حیرت تھی
اثر ہونے پہ کیوں ہے شیخ حیراں وقف حیرت ہوں

ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی طرح عورتوں کی سیاست سے بے خبری بھی قوم کو ذلت میں ڈھکیل دے گی۔

عابد سمیع الدین ان کے بارے میں لکھتی ہیں:

"زاہدہ خاتون کے سیاسی خیالات پر اس زمانے کے قومی اخبارات زمیندار ، ہمدرد، الہلال، کا گہرا اثر تھا۔ ان اخبارات کے افکار اور تخیلات کو ان سیاسی معتقدات کی اساس کہا جائے تو بے جانہ ہوگا یہ وہ وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار" الہلال" ملک بھر میں بے مثال مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔"

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب" ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ،ص،179)

ملکی سیاست کے بارے میں ان کے پختہ شعور کا اندازہ ایک مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قومی سیاست کے بارے میں زاہدہ خاتون ایک مستحکم عقیدے پر پہنچ گئی تھیں۔گاندھی جی کی شخصیت کا سحران پر بھی چل چکا تھا، قومی آزادی کا مطلب،سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، حمایت مزدور وغیرہ بھی سیاسی تحریکات جو اس وقت ہندوستان میں اپنے شباب پر تھیں وہ ان سب کی خلوص دل سے موید تھیں ملکی اتحاد پر ایک نظم "ترانہ اتحاد" میں وہ کہتی ہے۔

جنت کی دید سے ہے دل شاداں ہمارا
شکر خدا وطن ہے ہندوستان ہمارا

زاہدہ خاتون سودیشی تحریک اور ترک موالات میں عملی طور پر شریک ہونا چاہتی تھیں۔سعادت مند بیٹی اور شفیق باپ کے خیالات میں تصادم ناگزیر تھا۔تاہم انھوں نے اپنی اس خواہش کو بھی شعری جامہ پہنایا۔ ان کی شاعری آزادی کے بارے میں اور ان آزادی کے متوالوں کے بارے میں سودمند ثابت ہوئی۔آخر کار یہ مجاہدہ آزادی 27 سال کی عمر میں اس فانی دنیا سے چلی گئی۔

13: زبیدہ بیگم: تحریک آزادی کی یہ مجاہدہ ضلع مظفر پور بہار میں 1885 میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد سید عبدالفتح رجسٹرار تھے۔ ان کی شادی معروف قومی رہنما مولانا شفیع داؤدی سے ہوئی۔اپنے شوہر کے سیاسی نظریات کا اثر انھوں نے پورے طور سے قبول کیا۔بی اماں کے ان کے یہاں قیام کرنے کے موقع پر اور جلسوں میں ان کی پر اثر تقریروں کے سحر میں گرفتار تھیں۔تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں مولانا شفیع داؤدی نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ڈاکٹر عابد سمیع الدین اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں:

"زبیدہ بیگم ایک پردہ نشین خاتون تھیں۔شوہر کے ہمراہ وہ ہر عوامی جلسے میں شریک ہوتی تھیں اور خود بھی خواتین کے جلسے منعقد کیا کرتی تھیں۔ وہ ان سبھی خواتین کا حوصلہ بڑھانے میں ہر ممکن مدد کرتی تھیں۔جن کے شوہر نیز دوسرے عزیز قومی آزادی کی خاطر قید و صعوبتیں جھیل رہے تھے۔کھادی کے کپڑوں میں ملبوس خواتین شفیع منزل کی شاندار احاطے میں جمع ہوتی تھیں۔بیگم زبیدہ چرخے کی کلاس بھی وہیں پر لیتی تھی۔اس عمارت کے وسیع و عریض لان میں گاندھی جی نے بھی خواتین سے خطاب کیا تھا۔"

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب" ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ،ص،192)

14: کنیزہ بیگم چھپرہ: ملک کی آزادی اور غلامی کی زنجیروں کو اکھاڑ پھینکنے والی یہ مجاہدہ سارن بہار میں 1890 میں پیدا ہوئی۔آپ سید مبارک حسین اور بہار کے ممتاز رہنما سید صلاح الدین کی چھوٹی بہن تھیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ان کی شادی جناب حسین صاحب سے ہوئی جو بیرسٹرایٹ لا تھے۔علی برادران، مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے سیاسی

عقائد کو اپنا مشن بنالیا تھا۔تحریک خلافت کے دوران خواتین کے جلسوں کو خطاب کرتی تھیں۔ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں میں ان کے بڑے بھائی سید اصلاح الدین حسین کی ہدایات شامل ہوتی تھیں۔

آخر کار یہ مجاہدہ کنیزہ بیگم 1955 میں اپنے شوہر کی وفات کا صدمہ جھیل نہ سکی اور اس فانی دنیا سے چل بسی۔

15: منیرہ بیگم: ان کا نام بھی تحریک آزادی کے پروانوں میں شمار کیا جانا چاہیے گرچہ کہ انھوں نے خود ایسا کوئی کام نہیں کیا مگر انہوں نے اپنے شوہر مظہرالحق کو آزادی کی لڑائی میں بھرپور ساتھ دیا۔اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے تحریک خلافت کے لیے چندہ میں انھوں نے اپنے چار قیمتی ہیرے سے مرصع کنگن پیش کر دیے تھے۔اس کا اعتراف گاندھی جی نے ایک خط میں یوں کیا تھا۔''جب انھوں نے کنگن پیش کئے تو میرا دل جذبات سے بھر آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے طیب جی خاندان سے قریب ہونے کا موقع دیا''

16: عصمت آرا بیگم: عصمت آرا بیگم کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے غیر ملکی کپڑوں میں آگ لگائی تھی اور بائیکاٹ کی مہم میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔انھوں نے بی اماں کے ساتھ اپنے گھر پر عورتوں کو ایک دفعہ خطاب بھی کیا جو جذبہ آزادی سے لبریز تھا۔ان کی اس تقریر کی گونج دور دور تک پہنچی تھی۔انہوں نے بھی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے اپنے قیمتی یعنی شادی کے سارے زیور خلافت کمیٹی کو بطور عطیہ پیش کیے۔

17: صغرا خاتون: صغرا خاتون عرف بگن کی پیدائش عثمان آباد ریاست حیدرآباد میں ہوئی۔بچپن میں شادی ہوئی اور پھر شوہر کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے وہ لکھنو میں اپنے ماموں کے پاس آئی۔لکھنو میں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی تو ان ہی دنوں ولایتی کپڑوں کے بائیکاٹ کی مہم چلائی جارہی تھی جس میں انھوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔وہ بھی کھدر پہن رہی تھی جس پر ان کا ماما سخت ناراض ہوتا تھا۔وہ سروجنی نائیڈو، شریمتی موتی لال نہرو، اور دوسری خواتین کے ساتھ بھی زنانہ جلوسوں میں شریک ہوتی تھیں۔جب تحریک خلافت کے سلسلے میں بی اماں لکھنؤ آئیں تو صغرا خاتون بھی بی اماں کے استقبال کے لیے فرنگی محل گئیں اور تحریک خلافت کے جلسوں کی روح رواں بن گئیں۔جب بی اماں نے چندہ جمع کرنا شروع کیا تو سب سے پہلے اپنے تمام زیور نذر کرنے والی خاتون صغرا بیگم ہی تھیں۔وہ زیور تقریباً پچاس تولہ اور جواہرات پر مشتمل تھے۔ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''صغرا بیگم کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور قومی و بین الاقومی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے کئی اخبارات ان کے مطالعے میں رہتے تھے۔خود ان کے مضامین، ہمدم، زمیندار، ہمدرد، میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ان کے پاس اخبارات نیز اپنے مضامین کا بڑا ذخیرہ تھا جو ایک بار گھر میں آگ لگ جانے کے سبب سب ضائع ہوگیا۔''

(ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین اپنی کتاب ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم عورتوں کا حصہ، ص، 198-197)

تحریک خلافت کے جلسوں میں شرکت کے لیے انھوں نے بارہ بنکی، کانپور، الہ آباد اور دہلی وغیرہ کے سفر کیے۔لکھنو میں 10 مئی بروز جمعہ 1968 کو انتقال کیا۔

ان کے علاوہ دیگر اور بہت سی عورتیں ہیں جنھوں نے تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون اور تحریک آزادی میں سرگرم کردار ادا کیا۔ چاہے اسٹیج یا اسٹیج کے پیچھے، چاہے گھر میں رہ کر یا گھر سے باہر جن میں بی، بی امت اسلام، آمنہ قریشی، فاطمہ عریضی، امینہ طیب جی، بیگم سکینہ لقمانی، ریحانہ طیب جی، حمیدہ طیب جی، فاطمی طیب جی، صوفہ صوم جی، شفاعت النساء بی بی، بیگم ماجدہ بانو، بیگم کلثوم سیایانی، فاطمہ اسماعیل، بیگم سلطانہ حیات انصاری، ہاجرہ زید احمد، زہرہ انصاری، مائی بخت آرا، ماجدہ حسینہ بیگم، ظہیرہ بیگم، فاطمہ بیگم، وغیرہ قابل ستائش ہیں۔جنھوں نے اپنا سب کچھ آزادی کے لیے وقف کردیا۔

1857 سے 1947 کے مابین ہندوستان کی آزادی کے لیے جتنی تحریکیں چلیں اور جتنی بھی کوششیں ہوئیں، ہر جگہ مسلمان اول دستہ کے طور پر نظر آتے ہیں اور ان میں بھی علمائے دین پیش پیش دکھائی دیتے ہیں ،مسلمان مردوں کے ساتھ ساتھ ابتدا سے مسلم عورتیں بھی تحریک آزادی میں پیش پیش رہی ہیں۔خواتین کی ہمت وحوصلہ شجاع، بہادری و بے باکی، جذبہ اور کردار خواتین کا بھی ہے۔دنیا کی تاریخ میں کوئی ذی شعور انسان، عقلمند، فلاسفر، ادیب دانشور خواتین کی سماجی، سیاسی، معاشی و اقتصادی، اور ثقافتی تبدیلی سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔اسی طرح ہندوستان کی آزادی کی صبح کی خاطر ہزاروں کی تعداد میں مسلم عورتوں نے قربانی دے دی اور ان ہی قربانیوں کی وجہ سے آج ہندوستان ایک آزاد ملک ہے۔ ■■■

Bilal Ahmad Mir
Shikargah, Tiral,
Pulwama-192123 (Jammu & Kashmir)

صالحہ صدیقی

ریڈیکل تحریک نسواں

ریڈیکل تحریک نسواں کا نام سنتے ہی زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں مردوں کے ظلم وستم کے خلاف نعرہ بلند کرتے ہوئے عورتوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگتی ہیں۔ جبکہ' ریڈیکل تحریک نسواں' میں پوشیدہ لفظ' ریڈیکل' کے معنیٰ' انتہا پسندی' ہرگز نہیں ہیں۔ اس لفظ کا آغاز' جڑ' کے لیے بنے لیٹن لفظ سے ہوا ہے۔ ریڈیکل تحریک نسواں کے اصول میں مردوں کے ذریعے کیے گئے عورتوں پر ظلم وتشدد کو سماج و معاشرے میں موجود سبھی طرح کے سیاسی رشتوں کی جڑ تک یا ان کی تہہ میں جاکر بنیادی وجوہات کی تلاش کرنا ہیں۔

اگر ہم ریڈیکل تحریک نسواں کے آغاز کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا آغاز1960 کے اواخر اور1970 کی ابتدا میں جزوی طور پر لبرل ازم کے خلاف احتجاج کے طور پر اور جنسی امتیازات کے خلاف غصے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ میں ریڈیکل تحریک نسواں کی ابتدا ہوئی، زیادہ تر ابتدائی ریڈیکل تحریک نسواں شہری حقوق اور جنگ مخالف تحریک پر موکوز نو وام پنتھی تنظیموں میں شامل رہے جہاں انھیں روایتی اداروں کی طرح جنسی امتیازات اور عورتوں کو نیچا دیکھنے کے صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے حالات میں عورتوں نے بدلے میں مرد حاوی تنظیموں کو چھوڑ کر اپنی الگ تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی ریڈیکل تحریک نسواں گروپ' کڑوا بولنے والے' کے ماؤ وادی برتاؤ پر مشتمل' شعور' بڑھانے کے کام میں لگے چھوٹے چھوٹے گروپ تھے، ان کے زیادہ تر رکن نوجوان تھے، انتظامات سے الگ تھلگ پڑے تھے اور تبدیلی کے لیے بے چین و پریشان تھے۔ اس کے علاوہ نسوانی تحریک یا' تانیثیت' ایک ایسی تحریک ہے، جو صدیوں سے چلی آ رہی عورتوں کی زبوں حالی کے خلاف احتجاج بلند ہے۔ لفظ' تانیثیت (Feminism) ایک جدید اصطلاح ہے۔ جو لاطینی زبان کے لفظ 'Femina' سے مشتق ہے۔ جس کے معنیٰ' نسوانی اوصاف رکھنا' ہے۔ 'Feminisim' لفظ کا استعمال کب اور کیسے ہوا؟ یہ ایک اختلاف کن مسئلہ ہے، لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس لفظ کا سب سے پہلا استعمال فرنچ میڈیکل ٹکسٹ میں 1871 میں کیا گیا۔ اس لفظ کا استعمال ابتدا میں ایسے لوگوں کے لیے کیا جاتا تھا جن میں کسی وجہ سے نسوانی اوصاف پیدا ہو جاتے تھے۔ بقول فریڈ مین کہ:

'The term 'Feminist' seems to have first been used in 1871 in a French Medical text to discribe a cessation in devlopment of the sexual organ and chareterstics in male patients who where percived as thus suffering from 'Feminisation' of their bodies.

(Feminis. 2002, pg-2)

کچھ عرصے کے بعد فرانس کی ایک تخلیق کار Alexander Dumas Fils نے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے لفظ 'Feminist' کا استعمال ایسی عورتوں کے لیے جو بے باک اور بہادر

مزاج رکھتی تھی۔ ابتدا میں 'Feminist' کا استعمال نسوانی اوصاف کے بیان کے لیے کیا گیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کے معنی میں بدلاؤ آیا اور یہ ایسے لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا جو 'حقوق نسواں' کے لیے جدوجہد کررہے تھے اور آہستہ آہستہ یہ ایک رجحان سے تحریک تک کا سفر طے کرنے لگی۔ پھر یہ اصطلاح 'تانیثیت یا تانیثی تحریک' کے نام سے فروغ پانے لگی۔ 'تانیثیت' کی کوئی مستقل تعریف نہیں ملتی، بلکہ مختلف اہل قلم نے اس کو مختلف زاویے سے پیش کرنے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کا بنیادی نظریہ عورت کو بہ حیثیت انسان تسلیم کرواتا رہا ہے۔ عورتوں کو کسی ایک دائرے تک محدود نہ رکھ کر اس کو مختلف شعبوں میں عزت و احترام کے ساتھ اس کو وہ تمام حقائق دیے جائیں جس کی وہ مستحق ہے۔ تانیثیت کی حتمی تعریف آسان نہیں کیونکہ جدید تانیثیت کے بہت سے دھارے ہیں۔ مثلاً فرانسیسی تانیثیت، امریکی تانیثیت، برطانوی تانیثیت اور سیاہ فام تانیثیت وغیرہ۔ تانیثی تحریک چونکہ مرد اساس معاشرے کے جبر و استحصال کے خلاف شروع کی گئی۔ اور آج یہ تحریک سماج میں سیاسی، سماجی، معاشی، صنفی اور دیگر معاملات میں بھی مساوات کی دعوے دار ہے۔ آج عورتوں کے حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ وہ جن حقوق کی مستحق ہے کیا وہ اسے حاصل ہے؟ یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو اس کے وجوہات کیا ہیں؟ عورت کی زندگی کیوں اس قدر مقید ہے؟ وغیرہ سوالات نے ان کو جھنجھوڑنا شروع کردیا جس نے آگے چل کر بغاوت کا بیج بونا شروع کردیا نتیجتاً ایک تحریک کا وجود سامنے آیا۔ اس تحریک کے ذریعہ پہلی بار عورتوں نے کھل کر اپنی پریشانیوں کو منظر عام کیا۔ یہاں ہم ریڈیکل نسوانی تحریک کو اس تناظر میں بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ساٹھویں دہائی کے اواخر میں اپنے ابتدائی مرحلے سے گزرنے کے بعد سے ریڈیکل تحریک نسواں میں کافی تبدیلی آئی ہیں۔ ریڈیکل تحریک نسواں حالانکہ وقت وقت پر کافی مشتعل اور بنیادی تحریری کام بھی انجام دیتی رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود انھیں اچھی طرح سے غور و فکر کرکے سوچے سمجھے طریقے سے سیاسی اصولوں کے ماننے والوں کے طور پر نہیں پہچانا جاتا۔ اس کے برخلاف یہ مغرب میں زمینی سطح سے (گراس روٹ) جڑی تحریک کا حصہ ہیں، جو ترقی یافتہ ہوتی 'نسوائی تہذیب' کا اہم حصہ ہیں۔ جو ادب، موسیقی، روحانیت، صحت، خدمات، روزگار اور تکنیکی عورتوں کو جز بنانے اور ان میدانوں میں انھیں بھی مواقع دینے کے لیے مسلسل کوشش کررہے ہیں۔

یوں تو ریڈیکل تحریک نسواں کے اصولوں نے 1970 کے بعد ترقی کے مراحل طے کیے لیکن اس میں پوشیدہ خاص موضوعات اور بحث و مباحثہ کے ذرائع اس کی بناوٹ میں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیکل تحریک نسواں کی توسیع ہم جنس تحریک نسواں، پارتھکیواد اور ماحولیاتی تحریک نسواں(Eco Feminism) مابعد جدید اور پس ساختیاتی تحریک نسواں، مادیت پرست تحریک نسواں، Liberal Feminism, Radical Feminism, Socialist Feminism, Feminism, Lesbian (Progressive Feminism, Psychoanalytic Feminism, Post Moderninst &) Modern Feminism, Post Structuralist Feminism, Materialist Feminism.

تحریک نسواں کا دائرہ آج بہت وسیع ہے، اس میں جغرافیائی کے ساتھ ساتھ نقطۂ نظر کے اعتبار سے بھی بہت سی شاخیں قائم ہوگئی ہیں۔ اس کے علاوہ آزاد خیال تانیثیت، شدت پسند تانیثیت، سماجی تانیثیت ترقی پسند تانیثیت لیسبین تانیثیت، تحلیل نفسی پر مبنی تانیثیت، جدید تانیثیت، وغیرہ کی بحث جاری ہے۔ مذکورہ اصطلاحوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تانیثیت آج کوئی ایک بندھی ٹکی اصطلاح نہیں بلکہ اس میں مختلف نظریات اور رجحانات شامل ہیں۔ جغرافیائی حدود، نظریات اور کلچر کے اعتبار سے تانیثیت کا دائرہ ایک دوسرے سے تھوڑا بہت الگ ہو سکتا ہے لیکن تمام کے بنیادی افکار ایک ہی ہیں یعنی تانیثی تحریک آج کے معاشرے میں سیاسی، سماجی، معاشی، صنفی اور دیگر معاملات میں بھی مردوں کے مساوی حقوق کی دعوے دار ہیں۔

1960اور1970 کی دہائی کے دوران جدید ریڈیکل تحریک نسواں کے اصولوں کے آغاز میں تین کتابوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ پہلی کتاب تھی سیمون دی بوائر کی 'دی سیکنڈ سکس' جو1949 میں فرنچ زبان میں اور1953 میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ وہ ایک فرانسیسی مصنفہ فلسفی، نہایت ذہین، نباض، وجودیت کی علم بردار، سیاسی کارکن، تانیثیت پرست اور سماجی اصول ساز تھیں۔ انھوں نے ناول، انشائیہ، سوانح، مونوگراف، خودنوشت سوانح، فلاسفی، سیاست اور سماجی مسائل پر بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی شہرت کی خاص وجہ ان کے ناول بالخصوص 'She came to stay and the Mandarins' ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کا سب سے مشہور Le deuxieme sexe treatise فرانسیسی زبان میں1949

جہانِ نسواں

میں منظر عام پر آیا، جس کا ترجمہ 1971 میں انگریزی میں The Second Sex کے نام شائع ہوا 'دی سیکنڈ سیکس' نے تحریک نسواں میں نئی روح پھونک دی، سیمون دی بوائر کا کہنا تھا کہ جنس کو جینڈر (Gender) سے الگ سمجھنا چاہیے، اور عورتوں کا استحصال جینڈر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ 'کوئی عورت کے طور پر پیدا نہیں ہوتا بلکہ اسے بنایا جاتا ہے۔ عورتوں کی قدرتی بناوٹ خاص کر اس کی جنسی قوت مردوں اور عورتوں میں چند بنیادی فرق کو جنم دیتی ہے۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ عورت دوئم درجے کی شے ہیں۔ سیمون دی بوائر کا کہنا تھا کہ عورتوں اور مردوں کی جینڈر کی بناوٹ بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ جنس کے بیچ برابر رشتے قائم کیے جاسکیں۔ اس کے علاوہ اپنی اس کتاب میں انھوں نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ عورتوں کو مردوں نے Other یعنی غیر بنا رکھا ہے۔ مذکورہ کتاب میں انھوں نے موجودہ اور رائج حقیقتوں کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ سیمون کا شمار وجودیت کے اہم نظریہ سازوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے عورت کے پیچیدہ مسئلے کو فلسفیانہ بلکہ وجدی تصور حیات و کائنات کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان کے مطالعے میں تجربے کی صداقت پوری طرح نمایاں ہے۔

سیمون نے ماضی و حال کی ادیباؤں کی تصنیفات کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی بات پر خاص توجہ دی اور کہا کہ ادیباؤں کی تحریروں پر جو فیصلے کیے گئے ہیں ان میں بے لوثی، غیر جانبداری و وسیع النظری کا فقدان ہے۔ ان کا تجزیہ یا تو ایک خاص قسم کے بنے بنائے فارمولے کے تحت کیا گیا ہے یا پہلے ہی سے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ موجودہ تحریر ایک عورت کے نوک قلم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس میں خامیاں ہونا لازم ہے۔ سیمون کا اصرار ہے کہ جب ان تحریروں کا مطالعہ نئی تانیثی آگہی اور ترقی یافتہ شعور کے تحت کیا جائے گا تو اس کے نتائج بالکل جداگانہ ہوں گے۔

ریڈیکل تحریک نسواں میں اور دو کتابیں جو میل کا پتھر ثابت ہوئی وہ 1970 کی دہائی میں شائع ہوئی 'کارل میلٹ' کی کتاب 'Sexual Politics' جو بیسویں صدی کے فرنچ امریکن اور انگریزی ادب میں موجود جنس سے متعلق موضوعات کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ پیش کرتی ہیں۔ میلٹ نے جنسی تعلقات کے وقت ہونے والی کیفیات سے متعلق مردوں کے ذریعے کیے گئے بیانات میں پوشیدہ مرد حاوی رشتوں کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ سیمون دی بوار کی اس بات سے بھی میلیٹ نے اتفاق ظاہر کیا کہ پدر اقتدار (پترستہ) سماج کی تعمیر مردوں نے کی اور ہماری پرورش بھی اسی طرح کی جاتی ہے کہ ہم اسے 'فطری نظام' مان لیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کی تعلیم وتربیت بھی اسی طرح کی جاتی ہے کہ عام طور پر وہ رومانی عشق کی تصویر کشی کے ذریعے اپنے اپنے جنسی کرداروں کی ادائیگی قبول کرتی ہیں، لیکن 'نارمل میلر' اور 'ڈی۔ ایچ لارنس' جیسے ممتاز مرد قلمکاروں کی تصویر کشی قطعی رومانی نہیں ہیں۔ وہ دراصل مردوں کی عورتوں پر (قدرتی دکھنے والی) جسمانی، نفسیاتی اور معاشرتی اقتدار کا اظہار ہوتی ہیں۔ 'دا ڈائلکٹیکس آف سیکس: داکیس فار فیمنسٹ ریولیشن' عنوان کی اپنی کتاب میں 'شولامتھ فائر سٹون' نے 'پدر اقتدار' (پترستہ) کی تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں تاریخی مادہ پرستی کی مارکسی تکنیک کا استعمال کیا، جس میں اس نے معاشی کلاس، جدوجہد اور جنس کلاس کی جدوجہد سے مساوات کے مقابلے کیے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ عورتوں کی جسمانی بناوٹ اور ان کی روپ ریکھا (جیوو گیان) ان کی جڑ میں سموئی ہیں یا ان کی تابع ہیں۔ حاملہ ہونا، بچے کی پیدائش اور بچوں کی پرورش کی پریشانیوں کی وجہ سے عورتیں ان قدرتی حالات میں خود کو کمزور محسوس کرتی رہی ہیں۔ نتیجتاً بقا کے لیے وہ مردوں پر منحصر رہنے لگی۔ عورتوں کے اس انحصار کا فائدہ مردوں نے اٹھاتے ہوئے اپنے مطابق اپنے ماتحت سماج کے سبھی ڈھانچوں کی تعمیر اپنے مطابق کی۔ جو صدیوں سے اسی طرح چلی آرہی ہیں۔ بھلے ہی آج حالات بدل گئے ہوں، جیو وگیانک وجوہات میں تبدیلی آچکی ہو لیکن مردوں کے بنائے ڈھانچے اسی طرح قائم ہیں۔ ان ڈھانچوں میں پوشیدہ ہیں رومانیت، محبت اور مثالی شادیاں اور وہ مرد تہذیب جو عورتوں کو کمزور بناتی ہیں اور جنسی توجہ بنائے رکھنے کی نہ پوری ہونے والی مانگوں کے لیے لگاتار کوشش کرنے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ اس ظلم و جبر کو ختم کرنے کے لیے 'فائر سٹون' جنسی تعلقات میں عورتوں کے کردار بالکل ختم کردینے کی تحریک کا مشورہ رکھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس 'جنس کلاس' کے استحصال کا خاتمہ ایک ٹیکنالوجیکل انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ گلاس کی ڈشو میں حاملہ کی جاسکے گی اور گلاس میں حامل کو بچہ ہونے تک رکھا جاسکے گا۔ فائر سٹون نے اس کے علاوہ ایک اور اہم راستہ اس پریشانی سے نجات کا بتایا ہے کہ 'ڈھیلے ڈھالے خاندانی ساخت کے ڈھانچوں' کی تعمیر جہاں بالغوں کے گروپ اور ان کی اولادیں ساتھ مل کر رہا کریں گی اور جہاں بچے بھی نوجوانوں کی اجتماعی ذمہ داری سنبھالیں گے۔

تحریک نسواں کی تاریخ میں ورجینیا وولف کا نام بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناول A room of one's

own میں ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے ناول میں، معاشرے میں عورت اور اس کی حیثیت کا ایک نئے زاویے سے تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے روم کو استعارے کے طور پر استعمال کیا اور کہا کہ عورت کے لیے نہ تو گھر میں کوئی جگہ ہے، نہ سماج میں اور نہ ہی ادبی تاریخ میں ہی ان کی کوئی جگہ متعین ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ گھر میں عورت کے لیے کوئی کمرہ ہی نہیں ہوتا ہے، ان کا کمرہ تو بس باورچی خانہ ہوتا ہے۔ اگر عورت کچھ تخلیق کرنا یا پڑھنا چاہتی ہے تو وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ اس کے پاس ایسا کوئی کمرہ ہی نہیں ہوتا جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر کچھ ادبی کام انجام دے سکے، کچھ تحریر کر سکے۔ وولف کا کہنا تھا کہ عورتوں کو ایک کمرہ اور کچھ پیسے دے دو تا کہ وہ محکوم نہ رہے، معاشی مضبوطی سے وہ بھی کچھ کر سکیں گی۔ انھوں نے پہلی بار صنفی تعلقات کو موضوع بنایا اور خاتون مرکوز مطالعے اور تعلیم کی بات کہی۔ ان کی دلیل تھی کہ پدری سماج کا تعلیمی نظام اور مطالعے کا طریقہ عورت کو بطور عورت مطالعہ کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ عورتوں کو باقاعدہ اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ مردوں کے نقطۂ نظر سے پڑھیں اور سوچیں اور انھیں کے بنائے اصول وضوابط پر قائم رہیں۔ جمالیات، اقدار اور ادبی معیار بندی سبھی کچھ مرد ادیبوں اور نقادوں کے بنائے ہوئے ہیں جو کہ پدری سماج کے پروردہ ہیں اور انھیں کو آفاقی کہا جاتا ہے۔ عورتیں آزاد ہوں اور وہ آزادانہ طور پر لکھیں ساتھ ہی وہ جس طرح سوچتی ہیں، اس طرح سے اپنے خیالات کا اظہار بھی اپنی تحریروں اور زندگی میں کریں، اس پر مرد اساس معاشرے کا جبر نہ ہو، ایسے حالات میں جو جذبات عورتوں کے سامنے آئیں گے دراصل اسے ہی حقیقی اظہار کہا جائے گا۔ وولف تذکیر و تانیث کے اس تصور کے خلاف ہے، جس سے وحدت اور ہم آہنگی کے بجائے نفاق اور دوئی کو تحریک ملتی ہے۔ وولف کے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں:

> 'اب تک جو ادب خواتین نے تصنیف کیا ہے اس پر مشروط کا جبر ہے۔ یعنی وہ نہیں ہے جو وہ لکھنا چاہتی تھیں بلکہ وہ ہے جو مشروط حالات کے جبر یا قاری کی توقعات کے جبر نے لکھوا دیا۔ اور بقول وولف قاری نے ہمیشہ اسے منفی نقطۂ نظر ہی سے دیکھا اور پڑھا ہے۔ اس سے بھی ایک تکلیف دہ صورت وہ ہے کہ بعض خواتین نے غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود لکھنا ہی ترک کر دیا۔'

(تانیثیت: ایک تنقیدی تھیوری: پس منظر مشمولہ، سمت، اپریل تا جون 2007)

یہی نہیں ورجینیا نے لفظیات اور تصورات کی بھی بات کی اور کہا کہ میں جس طرح سوچتی ہوں اور مطالعہ کرتی ہوں تو میں اپنے آپ کو مرد ادیبوں کے خیالات سے co-relate نہیں کر پاتی ہوں۔ انھوں نے قاری کو بھی اسی نظام کا پروردہ بتایا ہے کہ اس کی ذہن سازی بھی اسی طور سے ہوئی ہے۔ ورجینیا کے تصورات نے نسوانی تحریک کے نقطۂ نظر سے تنقید ادب وصحافت پر دیرپا اور دور رس اثرات قائم کیے۔

نسوانی تحریک سے وابستہ نقادوں نے پرانے تصورات کی دیواروں کو نہ صرف توڑا بلکہ یہ بھی بتایا کہ دراصل عورت کے تعلق سے جو تصورات ہم تک پہنچے ہیں، وہ سبھی تصورات مرد اساس معاشرے کا نتیجہ ہیں۔ ان کی تشکیل کے پس پشت وہ تذکیری رویہ برسرکار رہا ہے، جس نے ہمیشہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ خواہ اس فوقیت کی بنیاد کتنی ہی غیر منطقی، غیر عقلی، رسمیاتی اور مفروضاتی ہی کیوں نہ ہو۔ ان مصنفین نے یہ بھی ثابت کیا کہ تاریخی طور پر مرد اپنے محفوظ تصورات کا اطلاق عورت پر کرتا آ رہا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نے ہمیشہ کچھ نئے جواز بھی فراہم کیے ہیں۔ ان جوازوں میں بیش تر اخلاقی، صنفی اور عضویاتی ہیں۔ اس نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ طبعاً عورت ایک کم تر مخلوق ہے۔

ایک طرف تانیثی تحریک مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی قائل اور خواہاں ہے تو دوسری طرف بعض ایسی خواتین نظریہ ساز بھی ہیں جو عورت کی زبان کو مرد کی زبان سے مختلف قرار دیتی ہیں۔ اسی طرح بعض نقادوں نے خواتین کے ادب کو مردوں کے ادب سے منفرد قرار دیا ہے۔ فرانسیسی ادیبا ہیلین سکسائس، جولیا کرسٹیوا اور لوئس اریگرے (Helene Cixous, Julia Kristeva and Luce Iregray) نے خواتین کے ادب کو Ecriture یعنی تانیثی ادب کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کی نظر میں ایک ایسا ادب موجود ہے جو اپنے نظام الفاظ، نظام خیال اور نظام احساس کی بنیاد پر مردوں کے ادب سے مختلف نشانات کا حامل ہے مگر ان کے نزدیک یہ تفریق حیاتیاتی جبریت کا نتیجہ نہیں ہے۔

ریڈیکل تحریک نسواں میں بھلے ہی بہت سی شاخیں موجود ہوں لیکن ان میں بہت سی مماثلت بھی ہیں جیسے سبھی ریڈیکل حقوق نسواں کے علمبردار اس بات سے متفق ہیں کہ جنس پر مشتمل جینڈر کے فرق ہماری زندگی کے تقریباً ہر پہلو کی ساخت قائم کرتے ہیں۔ جس کا اثر ہر مقام پر دکھائی دیتا ہے۔ ریڈیکل تحریک نسواں کا مقصد ان امتیازات کا خاتمہ کرنا

ہے اور انھیں قانون، روزگار، سماج و معاشرت، تہذیب و تمدن، گھر جیسے تمام مقامات پر مساوات کا درجہ دلانا ہے جنس کی بنا پر بنائے گئے فرسودہ روایات کی زنجیر سے عورتوں کو آزاد کرانا ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیکل تحریک نسواں 'پدر سماج' اور 'مرد حاوی' سماج کی بھی مخالفت کرتا ہے، ان کے نزدیک عورتوں کو بچپن سے ہی پدرانہ سماج کے لیے ڈھالا جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ انھیں تعلیم و تربیت کے ذریعے اس تصوراتی دنیا سے نکال کر آزاد دنیا میں لایا جا سکے جہاں وہ اپنی مرضی کی زندگی چن سکے، ریڈیکل تحریک نسواں مردوں کے بنائے تہذیب و تمدن اور ان کے فرسودہ روایات کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ عورتیں مردوں کے بنائے اصولوں پر ان بنائے نقش قدم پر چلنے کے لیے مجبور ہوں۔

بہرحال ریڈیکل تحریک نسواں کے مقاصد یہ ہیں کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ جبر، آمادہ پرستی اور جنسی غلامی کے پچھڑے سے آزاد ہو کر اپنی آزادی کی زندگی بسر کریں، جہاں ان پر کسی طرح کا دباؤ مسلط نہ ہو۔ انھیں اپنے جسم پر عبور ہو۔ اس کے علاوہ ریڈیکل تحریک نسواں عورتوں کے لیے علاحدہ تہذیب کی تعمیر چاہتا ہے ایک ایسا نیا سماج جو مساوی، بھروسے اور جنس سے مساوات کے ریڈیکل نسائی تحریک کی بنیاد پر قائم ہو۔ ایسا سماج قائم کرنے کے لیے ریڈیکل تحریک نسواں کے لیے خاص مقام (Woman Space) کا آغاز کرنا چاہتے ہیں، جو مردوں کی دخل اندازی سے پاک اور آزاد ہو۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے لوگ اس تحریک کے مقاصد اور اس کی اچھائیوں کو جانے بغیر اس کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں انھیں علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ تحریک کیا ہے؟ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ وہ کون سے حالات تھے جن کی وجہ سے عورتوں کو اپنی الگ تنظیم قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی؟ عورت کیوں خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی؟ کیوں ترقی کے اس دور میں جہاں ہر دن تکنیک آسمان کی نئی اونچائیوں کو چھو کر بھی گھر کی عورت کچن تک محدود رہ گئی؟ اگر ہم بات خالص ہندوستان کی کریں تو گاؤں کی عورت آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں آج سے پچاس سال پہلے تھی، وہیں دوسری طرف ایک شہر کی عورت ڈیجیٹل لائف کا خواب دیکھ رہی ہے لیکن کیا واقعی ان دونوں طرح کی عورتوں کی زندگی میں آج کا یہ برابر کا حق دینے والا سماج (صرف کہنے اور سننے میں) دیہی اور شہری زندگی میں کوئی مماثلت کروا سکتا ہے؟ ■■■

(بشکریہ 'ادب سلسلہ' سہ ماہی، جلد 2 شمارہ 4، 2017)

فرہنگ آصفیہ سے

آفتابہ۔ ف۔ اسم مذکر۔ اصل میں (آب۔ تابہ) تھا۔ پہلوی (آفتادہ) ژ (آفتادہ) عوام (استادہ)۔ (فرہنگ نویس اس سیدھی بات کے بیان کرنے میں کہیں کے کہیں چلے گئے ہیں۔ کوئی آفتاب سے منسوب کرتا ہے کوئی گولائی سے اس کے معنی نکالتا ہے۔ کوئی چلمچی بتاتا ہے حالانکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ زبان فارسی میں پائے مواحدہ اور فائے معجمہ کا ہم بدل ہوتا ہے۔ چنانچہ زبان اور زفان۔ باو گفت فا او گفت۔ زبانہ اور زفانہ آیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوا ہے اور نیز آفتابہ میں دستی لگانا اور اس کے اوپر سر پوش کا ہونا اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ گرم پانی کا لوٹا ہے پھر جو اسے تئیں دقت میں ڈالیں تو کیا فائدہ؟)

(۱) ایک قسم کا لوٹا ہوتا ہے جس کے پیچھے ہاتھ کے بچاؤ کے واسطے دستی لگی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر سر پوش ہوتا ہے اس میں گرم پانی لیکر منہ ہاتھ دھوتے یا دھلاتے ہیں۔ گنگا ساگر

ماہِ کامل ہے ترے منہ دھونے کی سیلا بچی
آفتاب اے ماہِ تاباں آفتابہ ہو گیا (ناسخ)

منہ جو تو دھونے لگا وقتِ سحر اے رشکِ مہر
صاف سونے کا ہر لچھی آفتابہ ہو گیا (شہیدی)

منہ دھوتے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
کھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب (میر تقی)

منہ دھوتے وقت اسکے اکثر دکھائی دے ہے
خورشید لے رہا ہے اک روز آفتابہ (میر تقی)

عائشہ فرحین

اُف یہ گرمی۔۔۔۔!

انسان ہمیشہ سے قدرت کے بدلتے تیور سے خود کو نبرد آزما کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اسی کوشش میں اس کی صبح وشام ہوتی ہے، زندگی تمام ہوتی ہے۔ انسان بھی بڑا بے صبرا اور اضطرابی کیفیت کا مالک ہے، اسے نہ زیادہ بارش برداشت ہوتی ہے نہ خزاں کا حد سے زیادہ روکھا سوکھا منظر راس آتا ہے وہ، موسم سرما کی سردی سہہ سکتا ہے، نہ موسم گرما کی گرمی، بارش زیادہ ہوجائے تو اُف یہ بارش، سردی زیادہ ہوجائے تو اُف یہ سردی، گرمی زیادہ ہوجائے تو پھر اُف یہ گرمی کا ورد کرتے نہیں تھکتا، حالانکہ وردتو خدا کی خدائی اور عظمت کا ہی کرنا چاہیے۔

انسان اتنا غیر مستقل مزاج ہے کہ اسے کسی حال میں بھی چین و قرار نہیں، ہر حال میں وہ اپنے شکوے شکایتوں کا دفتر کھولے بیٹھتا ہے کہ ع

صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

سردی زیادہ ہو تو شکوہ، بارش کی کثرت ہو تو نالاں، گرمی کا پارہ بڑھ جائے تو پھر اس کا اپنا پارہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔ موسم کے بدلتے تیوروں سے وہ کبھی خوشی تو کبھی غم مناتا ہے۔ ہر چیز اعتدال کے ساتھ ہو تو سود مند، ورنہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ آج کل ہم اور آپ موسم گرما کی زیادتی کے شکار ہیں، جسے دیکھئے گرمی کی شدید لپیٹ میں پریشان حال ہے۔

ایسے میں ہمارے شہر گل و برگ کی تو بات ہی منفرد ہے، بے شک ہمارا شہر ''گل و برگ'' سے بنا ''گلبرگہ'' ہے لیکن گر کوئی موسم گرما میں تلاش ''گل و برگ'' کی سعی مسلسل بھی کرے گا تو منھ کی کھائے گا، یہاں کی گرمی کے کیا کہنے! یہ کبھی 44 تو کبھی 47 ڈگری سیلسیس تک پہنچ کر عوام کے ذہنوں پر یوں سوار ہے کہ نیند میں بھی ''اُف یہ گرمی! کی صدائیں بلند ہورہی ہیں۔

اس گرمی نے کئی گھروں میں خوشیاں بانٹیں تو کئی گھروں سے ان کا سائبان بھی چھینا ہے۔ اسی گرم لو کی بدولت کسی کے گھر اے سی، کسی کے پاس فریج تو کہیں پنکھا، کہیں مٹکہ کی آمد ہوئی اور اسی تپش کی وجہ سے کئی بزرگ خواتین وحضرات بے سود تو بعض ہمیشہ کے لیے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اب سورج جی کی اس بے رحمی کا گلہ ہم کس سے کریں، اس کے نہ کان ہے نہ کان پر جوں، جو وہ ہماری باتوں سے اثر لے، کوئی جیے یا مرے وہ تو اپنے بنائے محور پر روز گردش کرتا ہے، اور انشاء اللہ تا قیامت گردش کرتا رہے گا۔ روز اسی طرح پورے آب وتاب سے آسمان پر جلوہ افروز ہوتا رہے گا۔ اس کی اس شان بان کے آگے ہم اور آپ منھ کھولنا تو دور، آنکھ بھر کر دیکھنے سے بھی معذور ہیں۔

محکمہ موسمیات بھی سورج کے ہر پل بدلتے مزاج سے بے خبر ہیں۔ ادھر انھوں نے یہ قیاس لگایا کہ آج سورج جی سب پر مہربان ہو گئے اُدھر موصوف کا مزاج ایسا بگڑا کہ بھی اُف یہ گرمی، اف یہ گرمی کہتے رہ گئے، کبھی جو یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ آج سورج جی کا مزاج بہت زیادہ بگڑے گا، اُس وقت سورج جی نے ایسے ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کیا کہ نہ صرف ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوتی بلکہ موسم بھی خوشگوار اور دلفریب ہوجاتا ہے۔ گویا موصوف نے ٹھان لیا ہو کہ موسم وبھاگ کی ہر پیشن گوئی کو غلط ثابت کریں گے۔ اب ایسے ہر پل بدلتے مزاج والے ''سورج جی'' کو ان کی

بے رحمی کا احساس دلانا گویا شہد کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنا ہے۔ بقول شاعر

اف یہ گرمی ہائے گرمی کیسی یہ گرمی آئی ہے
شدت گرمی سے دیکھو خلق کل گھبرائی ہے

خیر ہم تو خود ان کے بگڑے تیور کے شکار ہیں ایک ہاتھ سے پسینہ پوچھتے دوسرے سے انکا تعارف پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ موسم سرما ہو تو سورج کی آمد کے سبھی منتظر نظر آتے ہیں اور موسم گرما ہو تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ بس آج یہ آمد دیر سے ہو۔ مختلف پیشوں سے وابستہ خواتین وحضرات روزی روٹی کے چکر میں تو طلبا پڑھائی کے سلسلے میں گھر سے نکلنے پر مجبور ہیں، اب چاہے آندھی آئے طوفان یا گرمی کی شدید لو ہو انھیں تو اپنی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔

آج کل گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے سورج جی کا مزاج پتہ کرنا ضروری ہے۔ اگر موصوف کے تیور بگڑے ہوئے ہیں تو پھر سیر وتفریح کیا، شاپنگ جو خواتین کا محبوب مشغلہ ہے اس کو بھی ملتوی کردیتی ہیں۔ لیکن ہائے رے مجبوری کسی نہ کسی وجہ سے انسان کو گھر سے باہر نکلوا ہی دیتی ہے۔ اب جب گھر سے باہر قدم رکھنا ہی ہے تو پھر گرمی سے بچنے کے سارے نام نہاد طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں جیسے کوئی ٹوپی تو، کوئی چشمہ کوئی چھتری تو کوئی دوپٹہ اور کوئی آرام دہ اے سی کی کار میں خود کو مقید کرتا ہے۔

ایسے میں آپ بازار کا رخ کیجئے، وہاں بھی آپ کو ایک جم غفیر نظر آئے گا۔ آوازوں کا شور ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، ایسے میں بھاؤ تول، سے گاہک اور دکاندار دونوں کے مزاج گرم ہوجاتے ہیں۔ ایک تو سورج کی گرمی پھر انسان کے اندر کی گرمی دونوں مل کر وہ رنگ جماتے ہیں کہ کہیں بات صرف تو تو میں میں پر تو کہیں ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے۔

ایسی ہی گرمی میں جب ہمارے گھر ہماری عزیز دوست شاہانہ کی آمد ہوئی تو ہم نے ان سے اس گرمی کا ذکر کیا، چونکہ ان کے پاس ہمارے ہر مسئلہ کا ایک نیا ہی حل ہوتا ہے، ہماری پریشانی سن کر موصوفہ اپنے شاہانہ انداز میں یوں گویا ہوئیں، ارے آپ تو بے کار میں پریشان ہیں، میرے پاس اس گرمی سے بچنے کے ایسے ایسے حل ہیں کہ آپ خود بھی اس سے مستفید ہوسکتے ہیں اور دوسروں کو بھی مستفید ہونے کا موقع فراہم کرسکتے ہیں، فرض کیجئے آپ بازار میں ہوں اور شدید گرمی محسوس کررہے ہیں تو ،سیدھے سے کسی ایئر کنڈیشنڈ شاپنگ مال میں چلے جائیں بھلے ہی آپ کو کوئی شاپنگ کرنی نہ ہو، لیکن یہاں ہر دکان میں جائیں اور تھوڑی تھوڑی دیر تک مختلف چیزوں کو دیکھتے رہیں، احتیاط یہ کرنی ہے کہ بس انتظامیہ کو یہ شک نہ ہو کہ آپ خریداری کرنے نہیں بلکہ گرمی دور کرنے آئے ہیں، دکانوں کے چکر سے تھک جائیں تو برقی سیڑھیوں سے کئی بار چڑھتے اترتے رہیے، گرمی دور ہوجائے گی، گرمی سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہے کہ آج کل جگہ جگہ ائیر کنڈیشنڈ اے ٹی ایم موجود ہیں، بس اس طریقہ کے لیے آپ کے پاس ایک عدد اے ٹی ایم کارڈ یا اس جیسے کوئی دوسرے کارڈ کا ہونا لازمی ہے، پھر آپ آرام سے کسی بھی اے ٹی ایم میں پیسہ نکالنے کے بہانے دیر تک گرمی سے بچ سکتے ہیں، اگر باہر کھڑے افراد آپ کے اس طرح دیر تک اندر رہنے پر شبہ ظاہر کریں تو انھیں بتادیں کہ اے ٹی ایم مشین میں کچھ خرابی ہے، جس کی وجہ سے پیسہ نہیں نکل رہا ہے، پھر وہ باہر سے ہی آپ کی اس اہم معلومات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نو دو گیارہ ہوجائیں گے، اس کے بعد آپ اپنا شغل یوں ہی دیر تک جاری رکھ سکتے ہیں۔ ایک اور طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر آپ گھر میں موجود ہوں اور گرمی محسوس کررہے ہوں تو سیدھے فریج کے سامنے جا کر اس کے دروازے کو کھلا چھوڑ دیں، بس گرمی دور ہوجائے گی، یہاں یہ احتیاط کرنی ہے کہ آپ کی اس حرکت کو گھر والے ودیگر افراد نہ دیکھ لیں ورنہ پانی ٹھنڈا نہ ہونے پر اُن کی گرمی کا بخار آپ پر ہی اترے گا۔ اس کے علاوہ بھی ایک آزمودہ طریقہ یہ ہے جو فی الحال ہم کررہے ہیں یعنی کسی کے بھی گھر مہمان بن کر چلے جائیں وہ خود چاہے بجلی بچانے کے غرض سے پنکھا بند کیے، گرمی میں تپ رہے ہوں لیکن آپ کے لیے اے سی آن کردینگے کہ بھائی مہمان تو پھر مہمان ہی ہوتا ہے، ساتھ ہی ٹھنڈے مشروبات سے آپ کی گرمی کی شدت کو کم کردینگے، جیسا کہ آپ نے ابھی مجھ ناچیز کے ساتھ کیا، خیر اب کسی حد تک میری گرمی دور ہوگئی اس لیے مجھے اب اجازت دیجئے، باقی طریقے اگلی نشست پر اللہ حافظ۔ ہم اپنی دوست کے بتائے طریقوں پر ابھی غور ہی کررہے تھے کہ ہمارے ایک اور دوست کی آمد نے ہماری سوچوں کو بریک لگادیا۔

اس گرمی میں انسان تو انساں جانور بھی پریشان ہیں اور اس سے بچنے کے نئے نئے طریقے اپنا رہے ہیں، انھیں جہاں کہیں کوئی پانی کا گڑھا یا نل نظر آجائے، اسی میں لوٹ پوٹ ہوجاتے ہیں، اگر اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہو تو پھر گرمی ان کے دماغ تک پہنچ جاتی ہے، ان کا سر ایسے پھر جاتا ہے کہ یہ کسی بھی انسان، حتیٰ کے بچوں پر بھی اپنی گرمی نکالنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

خیر سب کی اپنی اپنی مجبوری ہوتی ہے جو وہ اس کڑی دھوپ میں بھی بازاروں کی تفریح کرنے نکل پڑے ہیں۔ کوئی بیوپاری ہے تو کوئی خریدار کسی کو اپنے گھر کا چولہا جلانا ہے تو کسی کا چولہا اسی بازار کی بدولت روشن ہے۔

موسم گرما کا ذکر ہو اور ٹھنڈے مشروبات اور آموں کا ذکر نہ ہوں ایسا تو ممکن نہیں، بازاروں فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ بنے آم اور ٹھنڈے مشروبات کی یہ دکانیں جہاں گرمی کے شکار انسانوں کے لیے تقویت کا باعث ہیں تو وہیں کئی بے روزگار افراد کی روزی کا ذریعہ بھی۔اب اگر انسان گرمی کے ڈر سے باہر ہی نہ نکلے تو پھر ان کی روزی روٹی کا انتظام کون کرے۔موسم گرما ہو اور آم نہ کھائیں یہ تو ممکن نہیں، بقول غالبؔ "صرف گدھے ہی آم نہیں کھاتے" حالانکہ آج انسان نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ کئی نئی کمپنیوں نے نئی نئی تکنیک سے آم کے مشروبات بنائے ہیں، جس سے وہ سال بھر آم کا مزے لے سکتے ہیں، پھر بھی حقیقی مزہ تو آم کو آم کی طرح کھانے میں ہی ہوتا ہے ۔غالب یوں ہی آموں پر فدا نہیں تھے، اپنے اشعار میں آموں کو کچھ اس طرح سے خراج پیش کی ہے۔

باغبانوں نے باغ جنت سے
انگبیں کے بہ حکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر گلاس

موجودہ دور میں انسان تو انسان آم بھی مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، امیر ترین لوگوں کے لیے جہاں آم بہت ہی خوش نما، پیکٹوں میں پیک ہوکر مہنگے ترین شاپنگ مال کی زینت بن کر اپنا اسٹانڈرڈ بڑھاتے ہیں، وہیں فٹ پاتھ اور ٹھیلوں میں مختلف سائز اور حصوں میں بٹے آم اپنے عام ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں، یہ آم، عام و خاص لوگوں کے لیے قدرت کا بیش قیمت تحفہ ہوتے ہیں۔حالانکہ مہنگے شاپنگ مال میں سجے آم ہوں یا کسی اسٹال پر پڑے آم دونوں اللہ ہی کی تخلیق اور نعمت ہیں، جسے انسانوں نے اپنے اسٹیٹس کی نام پر بانٹ دیا۔بے شک امیروں نے اپنی دولت سے اللہ کی تخلیق، آم اور دوسری کئی چیزوں کو تقسیم تو کردیا لیکن پھر بھی وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر کبھی خود کوئی تخلیق نہ کرسکے۔خدا کی قدرت کے آگے امیر غریب سب بے بس ہیں۔یہی قانون قدرت ہے جو سب کے لیے یکساں ہے چاہے وہ اے سی کی سرد ہوا پانے والے آفیسر ہوں یا کسی جھونپڑے میں گرم لو کے تھپیڑے کھانے والے مزدور، ہر ایک پر گرمی اپنا ایسا جادو چلاتی ہے کہ سبھی کہہ اٹھتے ہیں کہ اف یہ گرمی!

اگر موسم گرما کی چھٹیاں ہوں، تو بچے خوش لیکن وہیں اس آفتِ نزول کے ساتھ امتحانات کی آمد ہو تو پھر خدا ہی خیر کرے ان بچوں کا، موسم گرما کے ساتھ ہی بجلی کی کٹوتی، پانی کی قلت کا مسئلہ بھی شروع ہوجاتا ہے ۔بجلی کی قلت، پانی کی قلت، ایسے میں امتحانات سر پر ہوں تو نہلے پہ دہلا۔ طلبہ اف یہ گرمی کہتے نہیں تھکتے۔اب وہ پڑھے بھی تو کیسے، گرمی ایسی کہ ہاتھ پسینہ پوچھنے میں، دماغ اپنی گرمی کو کنٹرول کرنے میں مصروف، دل تو کتابیں دیکھتے ہی بددل ہوجاتا ہے، آنکھیں ان سب سے پریشان ہوکر نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش کرتیں ہیں، لیکن گرمی کی وہ شدت ہے کہ نہ چین سے بیٹھنے دیتی ہے نہ سونے، نہ کھانے، ہاں البتہ پینے پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ایسے میں بے چارے بچے پڑھیں تو کیسے پڑھیں، اس لیے ان کی ناکامی کا سہرا بچوں یا اسکول کے اساتذہ کے سر باندھنے کے بجائے اسی گرمی کے سر باندھنا چاہیے۔اب جب ناکامی ہی مقدر ٹھہری تو پھر گھر کے کام ان کی مجبوری، گرمی ہو تو بچوں کو فریج کے ٹھنڈے پانی کی بوتلوں اور ایئر کولر میں پانی بھرنے جیسے اہم کام سپرد کیے جاتے ہیں۔بچے کبھی خوش اسلوبی سے تو کبھی چاکلیٹ کی لالچ میں تو کبھی اپنی ناکامی کے جرم میں ان کاموں کو کرنے پر مجبور ہیں۔

خیر گرمی کے کرشمے بے حساب ہیں یہ کسی کو گھر سے باہر تو کسی کو گھر میں مقید کردیتی ہے، کسی کو باپردہ تو کسی کو بے پردہ بھی کردیتی ہے۔آپ گرما میں اپنے آس پاس نظر تو دوڑائیں، ہر طرف آپ کو باپردہ خواتین کے ساتھ باپردہ مرد حضرات بھی نظر آئیں گے، جو اپنے جسم کے ساتھ چہرہ کو بھی یوں چھپاتے ہیں جیسے پردہ ان ہی پر فرض ہوا ہو اور وہ اس کی پابندی کرنے میں سرفہرست ہوں، حالانکہ ان میں بیشتر وہ دوشیزائیں ہوتیں ہیں، جنھیں دیگر ایام میں حجاب سے الرجی اور نقاب سے سانسیں رک جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔لیکن موسم گرما میں اپنی نازک جلد کی فکر انھیں باپردہ بنا دیتی ہے جوان کے بے پردہ سوچ پر بھی پردہ ڈال دیتی ہے۔

موسم گرما کی آڑ میں کئی لڑکیاں بے پردہ بھی ہوجاتی ہیں، موجودہ دور میں جدید فیشن کی بدولت لڑکیاں جدید تراش خراش کے چست اور چھوٹے لباس پہننے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کررہی ہیں، لیکن موسم گرما میں تو ہر کسی کو اس فیشن کو اپنانے کا سنہرا موقع مل جاتا ہے کہ بھائی گرمی جو ہے، بازاروں، اسکولوں، کالجوں جہاں بھی جائیے، لڑکیوں کا ایک جم غفیر ہے جو موسم گرما کے بہانے اپنے جسم کی نمائش کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔والدین یہ کہہ کر کہ ابھی تو چھوٹی ہے، یا ابھی بچی ہی تو ہے، جوان ہو تو یہ سوچ کر کہ کہیں لڑکی اپنی ساتھیوں کے ساتھ فیشن کے دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے، یا یہ کہ گرمی بھی تو ایسی ہے، مختلف بہانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں پر محبت کی پٹی تو باندھ لیتے ہیں، لیکن خود اپنی بچیوں کے لیے آخرت کی دہکتی ہوئی آگ کا انتظام کردیتے ہیں، پھر کیا موسم گرما، کیا موسم سرما، یہ بے حیائی پورے سال، رفتہ رفتہ پوری زندگی پر اس طرح حاوی ہوجاتی ہے جس سے چھٹکارہ پانا ناممکن ہوجاتا ہے۔

موسم گرما میں شادیوں کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔آپ تھوڑا تصور تو کریں کہ سارا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے،سب گرمی سے حیران ، پریشان ہر دوسرے پل کسی نہ کسی کو ٹھنڈا پانی چاہیے ،ایک کی فرمائش پوری کیجیے ،دوسرا حاضر،دوسرے کی پوری کیجیے ،تیسرا ،تیسرے سے چوتھا،یہ سلسلہ یوں ہی دراز ہوتا جائے گا،ایسے میں بجلی کی کٹوتی ،ہر طرف سے مختلف صدائیں بلند ہوں گی کہ بھائی پنکھا تو چلائیں ،کوئی ٹھنڈا پانی تو پلا دے،کوئی اے سی تو آن کردے کوئی آئس کریم ہی منگوا دے، آپ لاکھ سمجھائیں کہ بجلی چلی گئی ہے،لیکن آپ کی سنتا کون ہے۔اب چاہے یہ بجلی والوں کی غلطی کیوں نہ ہولیکن شرمندہ آپ کو ہی ہونا ہوگا،چونکہ آپ میزبان جو ہیں۔چاہے آپ نے اپنے بلس کلیر کردیے ہوں ،چاہے انورٹرلگوالیا ہو،لیکن گھنٹوں کے حساب سے برقی کٹوتی کا نظم ،آپ کے ہر انتظام پر پانی پھیر دے گا۔کسی گھر میں شادی ہواور بچے نہ ہوں یہ بھی ممکن نہیں،یوں تو بچے اپنے کھیل کی دنیا میں مگن ہوتے ہیں،لیکن ایک مخصوص گھنٹی ، ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالیتی ہے۔یہ گھنٹی والا بھی بڑا چالاک ہوتا ہے جدھر بچے دکھائی دیے اسکے قدم وہیں جم جاتے ہیں اور گھنٹی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے،تاوقتیکہ بچے اپنے بڑوں سے رودھوکر،گھر سر پر اٹھا کروالدین کی جیب ہلکی نہ کردیں،اب وہ دور گیا جس میں ہم اور آپ روپیہ،دوروپیہ میں برف کے رنگ برنگے گولے کھا کرخوش ہوجاتے تھے، اب تو بچوں کو 20،30، 40، 50، والی کون آئس کریم ہی چاہیے،فی بچہ کم سے کم 20 روپے روز ہی تیار رکھیے ،وہ بھی اپنے گھر کے بچوں کی گنتی کے حساب سے،ادھر گھنٹی کی آواز،اُدھر بچوں کی پکار،کچن سے خاتون خانہ کی گرمی میں ڈوبی للکار،سب کا ایک ہی پرچار کہ اف یہ گرمی!اُف یہ گرمی! اف یہ گرمی!

□□□

Dr. Ayesha Farheen
Lecturer B B Raza P.U. College
Gulbarga-585104 (Karnataka)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................... بتاریخ....................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com,sales@ncpul.in

دستخط

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین کی اختیارکاری سے متعلق سرکاری اقدامات

حکومت ہند کی خواتین کی اختیارکاری سے متعلق اسکیمیں

حکومت ہند نے 2001 میں خواتین کو سماجی و معاشی اعتبار سے بااختیار بنانے کے لیے پالیسی وضع کی تھی جو خواتین کو بااختیار بنانے سے متعلق قومی پالیسی (National Policy on Empowerment of Women) کے نام سے موسوم ہے۔ اس پالیسی کے تحت حکومت نے بہت سی اسکیمیں تیار کی ہیں۔ اس کے علاوہ وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام کے تحت بھی مختلف سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ سبھی خواتین بشمول مسلم خواتین ان کا پورا پورا فائدہ اٹھاسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت کی جو عام فلاحی اسکیمیں ہیں، جن کی تفاصیل انٹرنیٹ پر موجود ہیں اور مرکزی حکومت وریاستی حکومتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق وزارتوں سے حاصل کی جاسکتی ہیں، سب کے لیے دستیاب ہیں۔ مثلاً آئی سی ڈی ایس (آنگن واڑیاں) سروشکشا ابھیان، گرامین روزگار یوجنا، کشوری شکتی یوجنا، کریچ / دارالاطفال، نیشنل کریچ فنڈ، نیشنل چارٹر برائے اطفال، اڈیشا (STEP) خواتین کی تربیت وروزگار کا پروگرام سرو آلنجن، سوئم سدھ، خواتین کے لیے تعلیمی پروگرام، مانوی سرکشن ابھیان، فیملی کونسلنگ مراکز، راشٹریہ مہیلا کوش، معذوروں کے لیے مختلف اسکیمیں وپروگرام وغیرہ۔ ان اسکیموں کو 2 درجوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ معاشی اعتبار سے بااختیار بنانے سے متعلق اسکیمیں اور سماجی اعتبار سے بااختیار بنانے سے متعلق اسکیمیں۔ ان میں کچھ اہم اسکیموں اور حال ہی میں شروع کی گئی اسکیموں کی مختصراً تفصیل نیچے درج ہے۔

اسٹیپ (Step)

خواتین کی تربیت وروزگار پروگرام کے لیے امداد

(Support to Training & Employment Programme for Women)

جیسا کہ اس اسکیم کے نام سے ظاہر ہے یہ اسکیم غریب اور بے سہارا خواتین کو مختلف طرح کی تربیت دینے اور انھیں روزگار حاصل کرنے کا اہل بنانے کی نیت سے 87-1986 میں شروع کی گئی تھی۔ خواتین کو سہکاری اسکیموں میں شامل ہونے اور بہت سی ایسی خدمات انجام دینے کے لیے تربیت دینے کا عمل تاہنوز جاری ہے۔ یہ تربیت عام طور پر ایسی نوعیت کی ہوتی ہے جس سے عوام کو فائدہ پہنچے اور روزگار کے مزید مواقع فراہم ہوں۔ ان میں طبی جانچ، قانونی وطبی خواندگی، بنیادی تعلیم، امتیاز مردوزن کے خاتمے سے متعلق اسکیمیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس اسکیم کے تحت 10 روایتی شعبوں کی پہچان کی گئی ہے جن میں زراعت، پرورش مویشیان، ڈیری، ماہی گیری، ہینڈلوم، دستکاری، کھادی، دیہی صنعتیں وغیرہ شامل ہیں۔

نوعمر لڑکیوں کو بااختیار بنانے کے لیے راجیو گاندھی اسکیم 'سبلا'

(Rajiv Gandhi Scheme for Empowerment of Adolescent Girls (RGSEAG) – 'Sabla')

اس اسکیم کی خاص غرض 16 سال سے زائد عمر کی لڑکیوں کو پیشہ وارانہ تربیت دے کر معاشی اعتبار سے بااختیار بنانا ہے۔ اس اسکیم نے نوعمر

لڑکیوں کے لیے جو تغذیہ پروگرام بنایا تھا اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس اسکیم میں صحت، تعلیم، نوجوانوں سے متعلق پروگرام، ہنرمندی وغیرہ شامل ہیں۔

مرکزی سماجی بہبود بورڈ

{Central Social Welfare Board (CSWB) }

خواتین سے متعلق امور و شعبہ جات سے جڑی تنظیمیں خواتین کی فلاح و بہبود سے وابستہ اسکیموں کے لیے اس بورڈ سے گرانٹ لے سکتی ہیں۔ یہ بورڈ ہمیشہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے کہ ملک کے جو حصے زیادہ پسماندہ ہیں انھیں ملک کے دیگر حصوں کے برابر لانے کے لیے ضروری اقدام کیے جائیں۔

خواتین کی اختیارکاری کے لیے قومی مشن

(National Mission for Empowerment of Women)

اس مشن میں سماجی، معاشی اور سیاسی امور کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے چونکہ ان تینوں کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس مشن کا مقصد خواتین کو سماجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے بااختیار بنانا، جنسی امتیاز و استحصال، تشدد وغیرہ سے محفوظ رکھنا ہے اور ان شعبہ جات کو مزید مضبوط بنانا ہے جن سے خواتین تعلیم، طبی سہولیات، سرکاری اداروں سے حاصل ہونے والی ہر طرح کی سہولیات حاصل کرسکیں اور ملک کی بھاگیداری میں پورا پورا حصہ لے سکیں اور قومی، دیہی روزگار مشن (ایس جی ایس وائی)، نابارڈ، راشٹریہ مہیلا کوش، این ایس سی ایف ڈی سی، این بی سی ایف ڈی سی، این ایس کے ایف ڈی سی و قومی بینکوں کی فراہم کردہ سہولیات سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

راشٹریہ مہیلا کوش

(Rashtriya Mahila Kosh- (National Credit Fund for Women)

اس کوش کا مقصد ضرورت مند غریب خواتین کو آسان شرائط پر قرض فراہم کرنا ہے تاکہ انھیں جن مالی مشکلات کا سامنا ہے ان کا ازالہ ہوسکے اور وہ خصوصی طور پر دیہی اور غیر منظم سیکٹروں میں ہونے والی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ لے سکیں۔

خواتین کی معاشی اختیارکاری کے لیے جینڈر بجٹنگ

(Gender Budgeting and Economic Empowerment of Women)

بجٹ جہاں ایک طرف ہماری قومی آمدنی اور روزگار پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری جانب وہ سرکاری سرمایہ کاری کے رجحانات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور اس سے اس بات کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مساوات مرد و زن کے معاملے میں بھی اس کا کیا رول ہے۔ اسی مقصد سے حکومت ہند نے اب جینڈر بجٹنگ یعنی مساوات مرد و زن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بجٹنگ سے متعلق کارروائی کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے تاکہ متعلقہ شعبوں میں خواتین کے ساتھ برتے جانے والے امتیاز کو کم سے کم کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں جینڈر بجٹ سے متعلق گوشوارے کے ذریعے اس پورے کام پر نگرانی بھی رکھی جارہی ہے۔

ملازمت کرنے والی خواتین کے لیے ہوسٹل

(Hostel for Working Women)

اس اسکیم کے تحت ملازمت یافتہ خواتین کے لیے نہ صرف مختلف شہروں میں ہوسٹل بنائے جارہے ہیں بلکہ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی جارہی ہے اور انھیں روزگار حاصل کرنے کے قابل بنانے کے لیے پیشہ وارانہ تربیت بھی دی جارہی ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ یہ ہوسٹل سرکار کے ذریعے ہی بنائے جائیں بلکہ انھیں کرایہ پر لی گئی عمارتوں میں بھی منتقل کیا جاسکتا ہے یا انھیں کرایہ پر لیا جاسکتا ہے۔ شمالی مشرقی علاقے سے آنے والی خواتین پر گذشتہ چند سالوں میں کچھ سماج دشمن عناصر نے کئی بار حملہ کیا۔ حکومت نے اس بات کا نوٹس لیتے ہوئے راجدھانی میں کئی ہوسٹل بنانے کا منصوبہ تیار کیا ہے جن میں سے کچھ ہوسٹل زیر تعمیر ہیں اور جسولہ علاقے میں ایک ہوسٹل تو تیار بھی ہوچکا ہے۔

راجیو1 گاندھی نیشنل کریچ اسکیم

(Rajiv Gandhi National Creche Scheme)

چھوٹے چھوٹے بچوں والی خواتین کو نوکری کرنے یا کسی بھی قسم کا کوئی کام کرنے میں بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے خاص کر ایسی حالت میں جب گھر پر بچوں کو سنبھالنے کے لیے کوئی موجود نہ ہوں۔ حکومت نے اس غرض سے 2006 میں یہ اسکیم شروع کی تھی۔ اس اسکیم کے تحت 6 سال تک کے بچوں کو کریچ کی سہولیت فراہم کی جاتی ہیں۔ اس اسکیم کو غیر سرکاری اداروں اور حکومت کے مختلف اداروں کے ذریعہ عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس اسکیم کے نفاذ سے ایسے خاندانوں کو کافی راحت ملی ہے جن میں بچے کے ماں اور باپ دونوں ہی ملازمت میں ہیں اور بچہ یا بچے، جیسی بھی صورت ہو، گھر پر اکیلے رہتے ہیں۔

اندرا گاندھی ماترتو سہوگ یوجنا (IGMSY) یعنی حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کو امداد فراہم کرنے سے متعلق اسکیم

اس اسکیم کے تحت حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کو نقد رقم ادا کی

جاتی ہے تاکہ وہ اپنی صحت کا بہتر خیال رکھ سکیں اور بہتر غذا کا انتظام کرسکیں۔

زنا بالجبر کا شکار خواتین کو مالی و دیگر امداد بہم کرانے کے لیے اسکیم

(Financial Assistance and Support Services to Victims of Rape)

جنسی تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کو دیکھتے ہوئے، بین الاقوامی دستاویزات اور ملک کے قوانین کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، خواتین سے متعلق قومی پالیسی کا احترام کرتے ہوئے اور ساتھ ہی مساوات مردوزن کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی نیت سے یہ اسکیم تیار کی گئی ہے تاکہ اس قسم کی صورت حال سے دوچار خواتین کو نہ صرف مالی امداد بہم پہنچائی جاسکے بلکہ انھیں مصیبت کے وقت میں سہارا بھی دیا جاسکے اور انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔

بالیکا سمردھی یوجنا (بی ایس وائی) یعنی بچیوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اسکیم

{Balika Samriddhi Yojana (BSY)}

اس اسکیم کے اغراض میں بچی پیدا ہونے پر منفی سوچ میں تبدیلی لانا، بچوں کو اسکول میں داخلہ دلانا، شادی کی عمر میں اضافہ کرنا، لڑکیوں کے لیے آمدنی کے ذرائع پیدا کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ بچوں کے تحفظ سے متعلق اسکیموں پر نظر رکھنے کے لیے Integrated Child Protection Scheme (ICPS) تیار کی گئی ہے اور اس کے مونیٹرنگ کا انتظام کیا گیا ہے جس کے Monitoring formats تیار کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو گود لینے سے متعلق تمام امور کی ضابطہ بندی کی غرض سے اور گود لینے کے عمل پر کڑی نظر رکھنے کے لیے Central Adoption Resourse Authority (CARA) قائم کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بچوں کی کلی نشوونما و پرورش جیسے امور کا مطالعہ و تحقیق کرنے کے لیے National Institute of Public Co-operation and Child Development (NIPCCD) قائم کیا گیا ہے۔

کشوری شکتی یوجنا (کے ایس وائی) یعنی نوعمر لڑکیوں کی اختیارکاری کی اسکیم

{Kishori Shakti Yojana (KSY) }

اس اسکیم کے اغراض میں نوعمر لڑکیوں کے لیے بہتر غذا، بہتر طبی سہولیات وغیرہ فراہم کرنا، انھیں عام صحت، حفظان صحت، عام خاندانی امور، ہنرمندی، تعلیم، سماجی ماحول وغیرہ سے متعلق معلومات سے ہم آہنگ کرنا شامل ہیں۔

اس کے علاوہ نوعمر لڑکیوں کے لیے قومی تغذیہ پروگرام بھی شروع کیا گیا ہے اور 3 سال سے 6 سال تک کے بچوں کے لیے شروع بچپن میں ہی دی جانے والی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ بنیادی تعلیم کی آفاقی حیثیت کو عملی جامہ پہنایا جاسکے اور اس ضمن میں مقرر کیے گئے ہدف کو پورا کیا جاسکے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ وقت اور صورت حال کے مطابق کچھ اسکیموں کے نام بدل دیے جاتے ہیں یا انھیں دوسری اسکیموں میں شامل یا ضم کردیا جاتا ہے اور کچھ اسکیموں کو غرض پوری ہونے کے بعد ختم بھی کردیا جاتا ہے۔ لہٰذا قارئین کے لیے یہ ضروری ہے کہ جب وہ ان اسکیموں کا فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی پیش رفت کریں تو پہلے اس بات کو یقینی بنائیں کہ متعلقہ اسکیم چل بھی رہی ہے یا نہیں۔

ہمارے ملک میں خواتین کی خواندگی کا تناسب اب بھی بہت کم ہے اور ہماری حکومت ہمیشہ اس کی طرف سے فکرمند رہی ہے اور خواتین کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانے کے لیے کوشش کرتی رہی ہے۔ قومی خواندگی مشن، جو مئی 1988 میں قائم کیا گیا تھا اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ 2007 تک 75 فیصد خواتین خواندہ کہلانے لگیں۔ اس ضمن میں کچھ پیش رفت تو ہوئی ہے مگر ابھی ہدف پورا کرنا باقی ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق بھی خواتین کی شرح خواندگی 65.46 فیصد ہے۔ حکومت ہند اس سلسلے میں بہت سے اقدام کرچکی ہے جن میں سروشکشا ابھیان، مڈڈے میل اسکیم، ضلع پرائمری ایجوکیشن پروگرام، مہیلا سمکھیا اسکیم، پرارمبھک شکشا کوش، قومی خواندگی مشن، جن شکشن سنستھان کا قیام شامل ہیں۔

قومی خواندگی مشن

یہ مشن 1988 میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ 15 سے 35 سال کی عمر کے 75 فیصد لوگوں کے خواندگی حاصل کرنے کے مشن کو پورا کیا جاسکے۔ ابھی یہ ہدف پوری طرح سے پورا نہیں ہوسکا ہے۔ اس مشن میں چھوٹے خاندان، مساوات مردوزن اور خواتین کو بااختیار بنانے اور عوام کے مختلف طبقات کے مابین باہمی میل جول پیدا کرنے جیسے امور شامل ہیں۔

جن شکشن سنستھان

اس ادارے کا مقصد سماجی، معاشی اور تعلیمی اعتبار سے محروم شہری/دیہی آبادی خاص کر غیر خواندہ، نیم خواندہ، درج فہرست ذاتوں و قبائل سے تعلق رکھنے والی خواتین اور لڑکیوں، جھگی جھونپڑی میں رہنے والے، ترک

وطن کر کے آنے والے مزدوروں وغیرہ کو وہ سہولیات میسر کرانا ہے جو دیگر طبقات کو زندگی کے مختلف شعبوں میں حاصل ہیں اور جنھیں تعلیم کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔اسی لیے یہ ادارہ خواتین کو پیشہ وارانہ ہنرمندی سے متعلق اسکیموں وغیرہ میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور انھیں روزگار حاصل کرنے اور دیگر طبقوں کے شانہ بشانہ وہم قدم چلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

سرو شکشا ابھیان

اس پروگرام کو ملک کے تمام ضلعوں میں روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد 6 سے 14 سال کے بچوں کو بنیادی تعلیم دلانا ہے۔ چونکہ آئین میں تعلیم کے حق کو ایک بنیادی حق مان لیا گیا ہے اس لیے اب یہ لازمی ہوگیا ہے کہ تمام بچے تعلیم حاصل کریں۔اس اسکیم کے تحت ایجوکیشن گارنٹی اسکیم، برج کورس وغیرہ آتے ہیں۔ یہ اسکیم اب عام ہو چکی ہے اور اس کا فائدہ عوام تک پہنچ رہا ہے اور ہمارے ملک میں تعلیمی بیداری کے معاملے میں بھی یہ ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔

مڈ ڈے میل اسکیم

یہ اسکیم 1995 میں شروع کی گئی تھی۔اس کے تحت بچوں کو دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے۔اب اس اسکیم کی اپر پرائمری اسٹیج تک توسیع کردی گئی ہے۔

ضلع ایجوکیشن پرائمری پروگرام

یہ پروگرام پرائمری تعلیم کے نظام میں ایک نئی روح ڈالنے کے لیے اور گھر گھر تک تعلیم پہنچانے کے لیے 1994 میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کا اصل مقصد سماج کے مختلف طبقوں میں عدم مساوات کو کم کرنا اور ایسے ضلعے جو نہایت پسماندہ ہیں انھیں منتخب کر کے ترقی کی اس منزل تک پہنچانا ہے جہاں تک دوسرے علاقے کے لوگ پہنچے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ اس بات کو بھی یقینی بنانا ہے کہ یہ طبقات قومی ریاستی ضلعی درجے کے منصوبہ بندی، مینجمنٹ اور پیشہ وارانہ امداد سے وابستہ تعلیمی اداروں سے مستفید ہوسکیں اور اس طرح چہار طرفہ سرگرمیوں میں بھاگیدار بن سکیں۔

مہیلا سمکھیا اسکیم

اس اسکیم کا اصل مقصد دیہی علاقے میں تعلیم سے محروم خواتین کو تعلیم یافتہ بنانے اور ان کی سوچ میں تبدیلی لانا ہے۔اس کے لیے انھیں تعلیم دلانا ضروری ہے۔ اب یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مہیلا سنگھ جیسے اداروں نے دیہی علاقوں کی خواتین کی سوچ میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلی لانے کے معاملے میں انتہائی مثبت کردار ادا کیا ہے۔

پرارمبھک شکشا کوش

2004 کے فائنس ایکٹ (تعدادی 2) میں تمام اہم مرکزی ٹیکسوں پر دو فیصد محصول لگانے کی بات کہی گئی تھی۔2005 میں اس کوش نے عملی شکل اختیار کرلی۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومتوں نے بھی خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف اسکیمیں تیار کی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ مرکزی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے میں بھی تعاون کر رہی ہیں۔

(ان اسکیموں و دیگر اسکیموں کی تفاصیل مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کی متعلقہ وزارتوں اور محکموں کی ویب سائٹ پر موجود ہیں)۔

گذشتہ دو سال میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے شروع کی گئیں اسکیمیں

ہماری موجودہ حکومت نے بھی گذشتہ ڈھائی سال کے عرصے میں تقریباً دو درجن اسکیمیں شروع کی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ان اسکیموں سے خواتین پورا پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں:

بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ

وزیراعظم نے اس اسکیم کا اعلان 22 جنوری 2015 کو ہریانہ کے تاریخی شہر پانی پت میں کیا۔ یہ اسکیم 100 کروڑ کی شروعاتی رقم کے ساتھ ملک کے 100 ضلعوں میں شروع کی گئی۔ ہریانہ میں اس اسکیم کے اعلان کی غرض ہریانہ اور ہریانہ جیسی دیگر ریاستوں کی توجہ اس جانب مبذول کرانی تھی کہ وہاں مرد وزن کے تناسب کا توازن بگڑ چکا ہے اور مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کم ہوتی چلی جارہی ہے۔اس اسکیم سے یہ توقع کی جارہی ہے کہ اس سے خواتین کے اندر بیداری پیدا ہوگی۔

سکنیا سمردھی یوجنا

وزیراعظم نے اس اسکیم کا اعلان 22 جنوری 2015 کو کیا۔اس کا مقصد ملک کی بیٹیوں کو سازگار ماحول فراہم کرانا ہے۔اس اسکیم کے تحت اگر بیٹی کے نام سے کھاتہ کھولا جائے تو سب سے زیادہ 9.2 فیصد سود ملتا ہے۔اس اسکیم کی تکمیل کی مدت کھولنے کی تاریخ سے 21 سال یا بیٹی شادی کی تاریخ، ان میں سے جو بھی پہلے ہو، ہے۔اس کھاتے میں پیسہ جمع کرنے سے انکم ٹیکس میں بھی چھوٹ ملتی ہے۔

پردھان منتری سرکشا بیمہ یوجنا

یہ اسکیم 9 مئی 2015 کو شروع کی گئی تھی۔اس میں 18 سے 70 سال کے سبھی لوگوں کو حادثہ میں موت ہوجانے یا مکمل طور پر معذور ہوجانے کی صورت میں 2 لاکھ روپے دیے جاتے ہیں۔

ڈیجیٹل انڈیا

یہ اسکیم 21 اگست 2004 کو شروع ہوئی تھی۔اس اسکیم کا مقصد تمام سرکاری محکموں اور عوام کے مابین الیکٹرانکی و ڈیجیٹل نظام کے ذریعہ

رابطہ قائم کرنا ہے۔ اس سے کاغذی کارروائی تقریباً ختم ہوجائے گی، کام جلدی ہوگا اور عوام کو تازہ جانکاری ملنے میں بھی آسانی پیدا ہوجائے گی۔

پردھان منتری جن دھن یوجنا

یہ اسکیم 28 اگست 2014 کو شروع کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت کوئی بھی پیسہ جمع کیے بغیر کھاتہ کھولا جاسکتا ہے۔ اس اسکیم میں اب کروڑوں کھاتے کھل چکے ہیں۔ کھاتہ کھولنے والے کو کوئی حادثہ درپیش آنے کی صورت میں بہ شکل بیمہ ایک لاکھ کی رقم ادا کرنے کی تجویز ہے۔

سوچھ بھارت ابھیان

یہ اسکیم 2 اکتوبر 2014 کو شروع کی گئی تھی۔ اس اسکیم کے تحت 1919 تک دیہی اور دور دراز علاقوں میں بیت الخلا اور صاف صفائی کی سہولیات مہیا کرانے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔

میک ان انڈیا

یہ اسکیم 25 ستمبر 2014 کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد بیرون ممالک کے ذریعہ ہندوستان میں سرمایہ کاری ہے۔ آگے چل کر اس اسکیم نے بین الاقوامی مارکیٹنگ کی شکل اختیار کر لی۔

پردھان منتری اجول یوجنا

یہ اسکیم یکم مئی 2016 کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد مالی اعتبار سے کمزور 3 کروڑ خواتین کو مفت رسوئی گیس فراہم کرنا ہے۔

سانسد آدرش گرام یوجنا

یہ اسکیم 11 اکتوبر 2014 کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ پارلیمنٹ کا ہر رکن 1919 تک 3 گاؤں کو اپنائے اور انھیں مثالی گاؤں بناتے ہوئے وہاں تمام ضروری سہولیات فراہم کرائے۔

اٹل پینشن یوجنا

اس اسکیم پر یکم جون 2015 سے عمل شروع ہوا۔ اس کا مقصد غیر منظم سیکٹر میں کام کرنے والے افراد کو پینشن کی سہولت فراہم کرکے انھیں سماجی تحفظ دستیاب کرانا ہے۔

پردھان منتری کوشل وکاس یوجنا

یہ اسکیم 15 جولائی 2015 کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد نوجوانوں کو تکنیکی تربیت دے کر صنعتی سیکٹر کو تربیت یافتہ فورس مہیا کرانا ہے۔ اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ صنعتی تربیتی ادارے قائم کرنے کی تجویز ہے۔

اسٹینڈ اپ انڈیا اسکیم

یہ اسکیم 5 اپریل 2016 کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد ہندوستانی صنعت کاروں کو مزید صنعتی یونٹ قائم کرنے کے لیے ان کی ہمت افزائی کرنا ہے۔ اس اسکیم کے تحت سرمایہ کاری سے ملک میں روزگار بڑھے گا۔ فہرست بند ذاتوں وقبائل سے تعلق رکھنے والے افراد اور خواتین کو سرمایہ کاری کے لیے 10 لاکھ سے 100 لاکھ روپے تک قرض مل سکے گا۔

کسان وکاس پتر

یہ اسکیم 1988 سے چل رہی تھی۔ اسے اب موجودہ حکومت نے پھر سے لانچ کیا ہے۔ اس میں ایک ہزار، 5 ہزار، 10 ہزار اور 50 ہزار کی رقم 100 مہینوں میں دوگنی ہوجائے گی۔

کرشی بیمہ یوجنا

اس اسکیم کے تحت کسانوں کو موسمی تغیرات کے باعث ہونے والے نقصان کی صورت میں امداد فراہم کرنا ہے۔

پردھان منتری گرام سینچائی یوجنا

اس اسکیم کا مقصد ملک کی مکمل زرعی اراضی کو سینچائی کی سہولیات فراہم کرانا ہے۔

سوائل ہیلتھ کارڈ

اس اسکیم کے تحت ایک ایسا کارڈ جاری کیا جاتا ہے جس سے مٹی کی جانچ کرائی جاسکتی ہے تاکہ کسان کو یہ علم ہوسکے کہ اس کے لیے کس قسم کے کھاد کی ضرورت ہے۔

نیشنل ہیریٹیج سٹی ڈیولپمنٹ اینڈ آگمینٹیشن یوجنا

یہ اسکیم 21 جنوری 2015 کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد ان شہروں کی ترقی ہے جن کا ہمارے ملک کی وراثت میں ایک اہم حصہ ہے۔ اس کام کے لیے 500 کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اجمیر، امراوتی، امرتسر، بدامی، دوارکا، گیا، کانچی پورم، متھرا، پوری، بنارس، ویلنکنی اور وارنگل میں یہ کام شروع ہوچکا ہے۔

اندر دھنش

اس اسکیم کے تحت 2020 تک بچوں کو ڈپتھیریا، کالی کھانسی، ٹیٹنس، ٹی بی، خسرہ اور ہیپاٹائٹس بی جیسی بیماریوں سے بچانے کے لیے ٹیکہ کاری کے عمل کو یقینی بنانا ہے۔

دین دیال اپادھیائے گرام جیوتی یوجنا

اس اسکیم کا مقصد سبھی گاؤں میں 24 گھنٹے بجلی پہنچانا ہے۔

دین دیال اپادھیائے گرامین کوشل یوجنا

اس اسکیم کا مقصد 18 سے 35 سال کے نوجوانوں کو روزگار مہیا کرانا ہے۔

مہاتما گاندھی پرواسی سرکشا یوجنا

اس اسکیم کا مقصد ہندوستان سے باہر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے پینشن اور زندگی کا بیمہ مہیا کرانے کی تجویز ہے۔

اڑان پروجیکٹ

اس پروجیکٹ کے تحت ریاست جموں وکشمیر میں 40 ہزار نوجوانوں کو 5 سال میں تربیت دے کر اہم ترقیاتی شعبوں میں روزگار کی مزید سہولیات فراہم کرنا ہے۔

خواتین سے متعلق ریاستی اسکیمیں

جہاں تک خواتین کی اختیارکاری کے معاملے میں ریاستوں کے کردار کی بات ہے متذکرہ بالا اسکیموں میں سے بیشتر اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ریاستوں کو ہی سونپی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف ریاستوں میں اپنی اپنی ریاستوں کی ضروریات کے مطابق عوام کے مختلف طبقات بشمول خواتین کو فائدہ پہنچانے کے لیے مختلف اسکیمیں بنائی ہیں اور بہت سے ادارے قائم کیے ہیں۔ آج کئی ریاستیں خواتین کی ہنرمندی کے تربیتی مراکز چلارہی ہیں۔ خواتین کو تعلیم کے لیے قرض فراہم کیا جارہا ہے، وظائف دیے جارہے ہیں اور اچھے نمبر آنے والی طالبات کو انعامات سے نوازا جارہا ہے۔ اسکولوں میں نہ صرف مفت کتابیں مہیا کرائی جارہی ہیں بلکہ انھیں مفت کھانا اور طبی سہولیات بھی فراہم کرائی جارہی ہیں۔ بچیوں کی شادی پر ان کے والدین کو شادی کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے بیشتر ریاستوں میں مالی امداد فراہم کی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ بیواؤں اور ضعیف خواتین کو وظائف دیے جارہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں یہ رقم کم ہے تو کہیں زیادہ، کہیں اس اسکیم کا نام 'الف' ہے تو کہیں 'ب' البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی تمام ریاستیں خواتین کو ہر طرح کی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے برسرپیکار ہیں۔ مگر خواتین کو بھی محاورتاً اس پیاسے کی طرح جو بڑھ کر خود جام اٹھالیتا ہے اور جام اسی کا ہوجاتا ہے، آگے بڑھ کر ان اسکیموں کا فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اس کے علاوہ بیشتر ریاستوں نے خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے ریاستی خواتین کمیشن قائم کیے ہیں۔ جہاں تک متذکرہ بالا اسکیموں کی مکمل تفاصیل کی بات ہے اب تقریباً سبھی ریاستوں کی ان اسکیموں کی تفاصیل متعلقہ ریاست کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ ہماری خواتین ان کی تفصیل وہاں سے دیکھ سکتی ہیں اور اگر وہ کمپیوٹر وغیرہ کی جانکاری نہیں رکھتیں تو این جی اوز سے رابطہ قائم کرسکتی ہیں یا سائبر کیفے میں جاکر وہاں کے اسٹاف سے مدد حاصل کرسکتی ہیں چونکہ آج انٹرنیٹ کی سہولیات کم وبیش سبھی جگہ موجود ہیں۔

اس کے علاوہ مرکزی حکومت نے خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے بہت سے قوانین بنائے ہیں اور کچھ ریاستوں نے ان قوانین میں اپنی اپنی ریاستوں میں ضروریات کے مطابق ترامیم بھی کی ہیں ان میں سے کچھ قوانین درج ذیل ہیں اور ان کی تفصیل متعلقہ ابواب میں دی گئی ہے۔

(1) ممانعت جہیز ایکٹ، 1961

(The Dowry Prohibition Act)

(2) خانگی تشدد سے خواتین کا تحفظ ایکٹ، 2005

(Protection of Women from Domestic Violence Act)

(3) قومی کمیشن برائے خواتین ایکٹ، 1990

(The National Commission for Women Act)

(4) غیر اخلاقی کاروبار (تدارک) ایکٹ، 1956

(The Immoral Traffic (Prevention) Act)

(5) طبی اسقاط حمل ایکٹ، 1971

(The Medical Termination of Pregnancy Act)

(6) دوران حمل تشخیص جنس تکنیک (انضباط و استعمال بیجا کا تدارک) ایکٹ، 1994

(The Pre-Ntal Diagnostic Techniques (Regulation and Prevention of Misuse) Act)

(7) زچگی سے متعلق مراعات ایکٹ، 1961

(Maternity Benefits Act)

(8) دیگر قوانین:

ان میں بچوں کے دودھ، دودھ پلانے والی عورتوں، مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث نوجوانوں کی بازآبادکاری، خواتین کے لیے اوقات کار مقرر کرنے جیسے امور کی بابت بنائے گئے قوانین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ قوانین میں ترامیم بھی کی گئی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خواتین کو دفتروں، کام کاج کے دیگر اداروں، تنظیموں وغیرہ میں جن جنسی حراسانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے تدارک کے لیے بنایا جانے والا قانون بھی کافی اہمیت کا حامل ثابت ہونے کی امید ہے۔

□□□

(خواتین کی اختیارکاری وصنفی مساوات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

سپنوں کے سائے

سیدہ اشرف

شیما نے ایک طویل آہ کے ساتھ بے کیفی سے بستر پر کروٹ بدلی اور اپنی تھکی تھکی بے جان سی آنکھیں دریچے کے شیشوں پر گاڑ دیں دسمبر کی سرد تاریک رات کا اندھیرا گاڑھا ہو رہا تھا۔ ساکت سی ویران اور ٹھٹھری ہوئی رات تھی۔ سنسان تاریک اور بھیگی ہوئی فضا — اسے اپنی زندگی میں بھی سرد تاریک اور ساکن سی معلوم ہونے لگی۔ دور کرسمس کے نغمات کی دھیمی دھیمی تانیں اس کے کمرہ کی خاموش فضا میں سحر انگیز کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے بے چینی سے پھر ایک مضطرب سی کروٹ لی۔ نہ جانے آج اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی۔ خلاف معمول آج وہ بہت ہی بے چین تھی۔ اس اضطراری کیفیت کرب نے شیما کے سینہ میں ایک عجیب نامعلوم سی خراش ڈال دی تھی۔ جیسے اس کے پھیپھڑوں میں آج کوئی نئے جراثیم سرایت کر گئے ہوں اس نے اپنی اس کشمکش اور قلبی کشاکش کا بڑی دیر تک تجزیہ کیا — نرس اپنی ڈیوٹی کے بعد پھر ایک بار اسے سو جانے کی ہدایت دے کر چلی گئی تھی — کرسمس کی رات تھی اور آج وہ سب خوشیوں کے نغمات فضا میں بکھیر رہی تھیں اور اس کی ہلکی ہلکی صدائیں شیما کو حد درجہ افسردہ کر رہی تھیں۔

شیما صحت گاہ کی ویرانیوں میں چھ ماہ سے زندگی کی تلاش میں رو گرداں تھی — نئی اور جیتی جاگتی زندگی — ایک سال! صرف ایک سال قبل والی خوبصورت اور چمکتی ہوئی صحت کی خواہش مند — شیما سوچنے لگی وہ کس قدر صحت مند اور تندرست تھی اس کی سفید رنگت میں آفتاب کی ہلکی سی تمازت سرخیاں دوڑا دیتی تھی۔ اور آج خزاں رسیدہ پتا کی طرح بے جان پڑی ہے — صحت و رشجر سے گرا ہو زرد بیمار پتا — غیر ارادی طور پر اس کی بے جان سی انگلیاں اس کے سوکھے سوکھے مرجھائے ہوئے رخساروں پر پھسلنے لگیں۔ کتنے تر و تازہ تھے یہ رخسار اور بھرے بھرے — اسے محسوس ہونے لگا جیسے دو جانی پہچانی انگلیاں اس کے سرخ و سفید رخساروں کو چھو رہی ہیں اور کان ان شیریں محبت بھرے الفاظ سے گونج اٹھے ہیں۔ 'سچ مچ شیما یہ رخسار 'گل شیراز' کو شرماتے ہیں۔ جیسے تمہارے جسم کا سارا خون یہیں سمٹ آیا ہے۔' اور وہ شرم سے اور سرخ ہو جاتی۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر آئینہ دیکھے شاید اس کے چہرہ پر پھر سے وہ اگلی سرخیاں جھلک رہی ہوں۔ جن کی تلاش میں وہ سینی ٹوریم کی اداس اور بے کیف فضا میں مسلسل چھ مہینے سے سانسیں لے رہی ہے لیکن اس کے جسم میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ اٹھ کر دو قدم چلتی اور ایک لمحہ دل کو جتلائے فریب کرتی — دور فضا میں نغمات مسرت بکھر رہے تھے۔ کرسمس کی خوشیاں انگڑائیاں لے کر پیدا ہو رہی تھیں۔ لیکن کمرہ کی فضا اداس تھی اور اس کا دل آج بے طرح ویران ہو رہا تھا، شیما نے پھر ایک آہ کے ساتھ حسرت بھرے انداز میں کروٹ بدلی وہ آنکھیں موند کر ماضی کے اندھیرے غاروں سے اپنی زندگی کی کھوئی ہوئی روشنیوں کی مشترکہ کرنیں سمیٹ لینا چاہتی تھی اور اپنی تھکی ہوئی روح کی بے قراریوں کو ان لمحات شیریں میں گم کر دینے کی آرزو مند، تاکہ یہ فریب ہی اس کے تڑپتے اور مچلتے ہوئے دل کو ایک پل کے لیے مطمئن کر دے۔ اسے ایک لحظہ کے لیے زندگی کے بچھڑے ہوئے راستہ پر مسرت کے ستارے جگمگاتے نظر آنے لگے۔ فرحت کی مسرت سے ہانپتی ہوئی آواز نے اسے چونکا دیا۔ 'باجی۔ باجی!' اس نے محویت کے عالم میں کتاب میں سر اٹھائے بغیر کہا — 'کیوں فرحت میں یہاں ہوں' — اور ایک لمحہ میں جیسے وہ دوسری دنیا میں پہنچ گئی —

یوکلپٹس کے لرزیدہ سایوں میں ہسٹری آف یورپ پر نظریں گاڑے اُس نے سنا کہ کل صبح نعمان بھیا آ رہے ہیں۔ باجی اور ننھی فرحت خوشی سے تالی بجا کر ناچ گئی۔ اس کی روح بھی جیسے مسرت سے جھوٹ اٹھی— نعمان چھ سال بعد یورپ سے واپس آ رہا ہے اور اس کی معصوم روح جیسے چھ سال پہلے کی پرانی دنیا میں جھانکنے لگی۔ ایک الھڑسی بے فکر اور آزاد دنیا جس میں مسرت کی شیرنیاں قہقہے مسکراہٹیں کھیل کود اور زندگی کے انجان راستہ پر منزل سے بے خبر بڑھے جانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ نگاہوں کے آگے ایک شوخ مچلتا ہوا چہرہ رقصاں ہوگیا۔ شفاف روشن ماتھے پر جھکے جھکے الجھے ہوئے بے ترتیب سے بال جو کبھی سنوارے ہی نہیں جاتے تھے اور خوابوں سے بھری ہوئی شربتی آنکھیں! ان میں کتنی زندگی اور کیسی انوکھی شرارتیں پنہاں تھیں۔

نوروز کا جشن اس کی ٹوٹی ہوئی امیدوں کا ایک شکستہ سہارا بن کر نگاہوں کے پردہ پر ابھرنے لگا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ جسے نواب مسعود نے نوروز کی رات سچ مچ شہزادہ ہی بنا دیا تھا۔ ریشمی طرہ اور صافہ چمکتی ہوئی اچکن زرکار جوتا جیسے عہد قدیم کی کوئی حسین تاریخی کہانی کا پُر اسرار— اس رات سب کی نظر نعمان کو کھائے جا رہی تھی۔ رقص و موسیقی قہقہے اور خوشیاں شبنم 'لبنا' الفریڈ۔ کوز۔ اور بلور سے گھرے ہوئے تھے نواب مسعود ایک چھپی ہوئی خواہش پر مسکرا کر بولے دیکھنا کہیں میری نظر نہ لگ جائے کچھ نذر اتار دو اس شہزادہ پر— بھولا بھالا معصوم سا شہزادہ—

اس رات سب کتنے خوش تھے۔ پرانے سال کی کینچلی اتار کر سب خوشبو اور عشرتوں کے سہانے سمندر میں غرق ہو جانا چاہتے تھے۔ سپنوں کے تار بنتے ہی چلے گئے۔ وقت کی عنکبوت نے اپنی نامعلوم رفتار سے پورا جال بن دیا— آخر ایک دن کالج کا شوخ وشنگ نعمان یورپ کی آزاد فضاؤں میں زندگی کے خوابوں کی حسین و جانواز تعبیریں ڈھونڈنے میں منہمک ہوگیا اور شیما آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھ سالوں کے الجھے ہوئے گچھے کو ٹٹولنے لگی۔ بے کیف اور بے مزہ زندگی— ایک بے جان سا تسلسل، بے مزاہ سا جمود، زندگی کا سمندر ساکن ہوگیا تھا—

اور پھر ایک حسین صبح یوکلپٹس کے لرزیدہ سایوں میں اس نے نغمۂ بہاراں کی طرح سنا کہ کل صبح نعمان آ رہا ہے— نعمان آ رہا ہے۔ جیسے زندگی کے ساکت سمندر میں تلاطم بپا ہوگیا۔ دل میں مسرت کے سوتے پھوٹ گئے۔ روح ان دیکھی راہوں پر رقصاں ہوگئی۔ نعمان آ رہے چھ سال بعد! وہ خیالات کی رو میں بہی جا رہی تھی، چھ سال نہ جانے جذبات کے کسی اشارے اور روح کی کس چنگی نے بتا دیے۔ شیما دل ہی دل میں جھینپ سی گئی۔ شرم سے اس کے رخسار تمتما اٹھے۔ اس کی روح جیسے وقت کے جوار بھاٹے میں پھنس کر رہ گئی ہو— زندگی کے سمندر کا بھاٹا ختم ہوگیا اور جوار کی اٹھتی ہوئی لہروں نے زندگی کا سارا امس اور بے کیفی جذب کر لی، نعمان نے اسے زندگی کے ایک بیش قیمت فلسفہ سے آگاہ کیا اس کی خاموش نبضِ حیات میں شعلۂ محبت سے تپش اور تڑپ پیدا ہوگئی— آج تک شیما جیسے صرف زندہ تھی لیکن آج وہ محسوس کرنے لگی کہ وہ زندگی کے حسن سے آگاہ ہوگئی ہے۔ جیسے وہ بلند آسمانوں پر کہکشاں کی چمکتی ہوئی لکیر کو راہِ حیات بنائے اور خراماں خراماں چلی جا رہی ہو۔ اک دم سے خیالات کے نیلے پیلے بوقلموں غبار سے ہوا کے ایک جھونکے سے بلندیوں پر پہنچ کر دم توڑنے لگے— شیما نے جھنجلا کر اپنی تھکی ہوئی بے جان سی باہیں بے کیفی سے بستر پر ڈال دیں۔ اس کی زندگی کا روشن اور مسکراتا ہوا راستہ حادثات کے طوفان سے کتنی جلد غبار آلود ہو جاتا ہے۔ شیما نے اکتا کر اپنی خشک ہتھیلیوں سے آنکھیں مل ڈالیں جیسے اس کی آنکھوں میں گرد و غبار بھر گیا ہو— ماضی کی شمع میں جھلملاتی ہوئی روشنی میں اس نے پھر کتاب حیات کے اس رنگین باب کا ورق الٹا، نعمان نے اسے چاہنے اور چاہے جانے کا لافانی سبق پڑھایا— آہ وہ حسین دن جبکہ نعمان اپنی زندگی کی تمام تر امنگوں اور روح کی گہرائیوں کے ساتھ اس کی ایک ایک ادا پر مرتا تھا۔ شاید: وہ عجیب و غریب سوچوں میں غلطاں ہوگئی۔

لیکن آج— آج وہ نہیں اس کی روح نعمان پر مر رہی ہے۔ نہ جانے صداقت کیا ہے؟— احساس حقیقت اسے جھنجھوڑنے لگا۔ ایک طرف صحت گاہ کی خاموش اور ساکن فضا دوائیں، غذائیں، احتیاط آرام، انجکشن، ایکس رے، نرسیں، ڈاکٹر اور دوسری طرف اس کی چپ چاپ زندگی— مسز شاما۔ اندرا۔ پرتما جو گوہر صحت کی تلاش میں برسوں سے اپنی زندگی سکوت کی اس ویران وادی میں گم کیے ہوئے ہیں۔ نہ جانے ان کا دل کس طرح بہلتا ہے— ڈاکٹر زیدی کا تبسم اور مردانہ وارڈ سے مستعار لی ہوئی خوشیوں کا فریب! اندرا۔ پرتما۔ مسز محمود اور صابرہ کی طرح اسے مطمئن نہیں کر سکتا— شیما سوچنے لگی ڈاکٹر کہتے ہیں خوش رہو فکر اور رنج کو پاس نہ پھٹکنے دو خوب کھاؤ پیو۔ ہنسو۔ کھیلو خوش اور بے فکر رہو۔ سو چامت کرو— خوب سوچا مت کرو! یہ سوچ کا سوچ ہی تو زندگی کے پنکھے کو چلا رہا ہے۔ ورنہ اب زندگی میں اس سوچ کے سوا دھرا ہی کیا ہے— کیا! وہ حیران ہو کر سوچنے لگی—

نعمان اس کی زندگی کے خاموش سمندر میں عشرتوں کا سیلاب بن کر داخل ہوگیا۔ نعمان کی عجیب و غریب فلسفیانہ باتیں لمبی لمبی سیریں رقص موسیقی تفریحیں ہنسی مذاق جیسے زندگی کے شاندار محل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ مستقبل سے بے خبر روح نشاط و طرب کی محفل میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ زندگی خوابوں کے گہوارے میں جھول رہی تھی— آزاد بے فکر اور لاپروا نعمان یورپ کی آزاد فضاؤں میں زندگی کو تمام تر عریانیوں کے ساتھ دیکھنے والا آزاد پرند دام ہوس میں پھنس کر ہندوستان کے پنجرے میں بند ہوگیا— بال روم۔ کلب۔ ناچ گھر سینما

سب نشاط رفتہ بن کر رہ گئے تھے۔اس کی دلچسپیوں کا محور صرف شیما تھی اور شیما کی محبت — شیما ماضی کے سہارے، بیداری کے اس خواب میں ایک گونہ لذت محسوس کر رہی تھی۔حیات گذشتہ کا ایک ایک لمحہ جیسے اس کی یادوں کے سمندر میں حباب رنگیں بن کر ابھر رہا تھا۔وہ نعمان کی معیت میں زندگی کے حسین خواب دیکھ رہی تھی۔اس کا منتہائے مقصود صرف نعمان تھا اور نعمان کی زندگی کا محور صرف شیما۔

پھر یکلخت جیسے خوابوں کا یہ محل خیالات کے سلسلہ کی طرح ٹوٹ گیا۔

خواب وخیال کی دنیا اجڑ گئی۔شیما کا جیسے دم گھٹنے لگا۔درد و کرب سے مضطرب سی ہوگئی۔غم ویاس نے اسے نڈھال کر دیا — فضا کرسمس کے نغمات سے مترنم ہو رہی تھی۔لیکن یہ ترنم خیزیاں شیما کے دل پر لحظہ بہ لحظہ ٹھیس لگا رہی تھیں وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی لیکن کرسمس کا بلند ہوتا ہوا فضا میں لہراتا ہوا ہر نغمہ اس کے دل کی راکھ کو کرید رہا تھا۔یہی کرسمس کی رات تھی خوشیوں سے معمور اور اس کی مسرت اس سے چھینی جا چکی تھی، اُف میرے اللہ، اس نے آنکھیں بند کر لیں۔رقص گاہ کا سماں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔نعمان کے آغوش میں وہ 'ایلس' کو محو رقص دیکھ رہی تھی وہ سوچنے لگی ایلس ایک گرجتے اور دہاڑتے ہوئے سمندر کی طرح اس کے اور نعمان کے درمیان داخل ہوئی اور وہ دو ساحلوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔جو باہم کبھی نہیں مل سکتے، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔شاید نعمان بھی اسے کبھی نہ مل سکے—

نعمان اس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا گویا اس کے جسم سے روح نکلتی چلی گئی۔نعمان کی طرح اس کی صحت نے بھی اس کی رفاقت سے منہ موڑ لیا۔نعمان کی جدائی اور بیوفائی کے غم میں شیما مومی شمع کی طرح پگھل رہی تھی۔شیما نے آنکھیں پھاڑ کر کمرہ کی فضا میں دیکھا اسے اپنے سینہ میں شدید درد کا احساس ہونے لگا۔وہ ایک لمحہ ساکت سی ہوگئی اور پھر خیالات کا طوفان امنڈ آیا— نعمان کی تباہی اور بربادی کی روح فرسا حقیقت اس کے سامنے جلوہ گر تھی۔ایلس ایک بوڑھے فوجی کرنل کے آغوش کی زینت بن رہی تھی۔اور نعمان اپنی ناکامی کے زخم کے لیے مرہم کی تلاش میں 'چور بازار' کا طواف کر رہا تھا معصوم منہ بند کلیوں کو چھیڑ کر یہ ظالم بھنورا کھلے ہوئے پھولوں پر فدا ہو رہا تھا۔جو زینت چمن بنے ہوئے ہیں اس کا محبوب نعمان چور بازار سے خوشیاں خرید رہا تھا۔چور بازار جہاں محبت بکتی ہے جہاں وہ ہر رات ایک نئے کھلونے سے جی بہلا سکتا تھا۔زندگی کے ہر شعبے سے چور بازار کیوں لگا ہوا ہے ہر طرف چور بازار اور پھر عورتوں کا چور بازار جہاں سے حسین آسودگی خریدی جا سکتی ہے۔

خوابوں کا سیمیں پردہ اس کی آنکھوں کو چندھیا کر آہستہ آہستہ سرکتا گیا۔

اور شیما ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ٹوٹے ہوئے دل کی متاع سنبھالے زندگی کے شکستہ کشتی کی پتوار تھامنے کی کشش کرنے لگی۔شدت احساس نے اسے مضطرب و بے قرار کر دیا، سینے کے غار میں سانپ رینگتا ہوا محسوس ہونے لگا اور پھیپھڑے ناسور رسنے لگے— نعمان زندگی اور اس کے تقاضوں سے مجبور ہو کر آخر کار جنگ کے ہولناک آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا کہ شاید اس طرح نامرادیوں اور ناکامیوں کا زخم بھر جائے— اور اس کے اپنے سینے کے زخموں میں خراش پیدا ہونے لگی۔ڈاکٹر کہتے ہیں یہ غار پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں— زخم بھر جائیں تو مرض پر قابو پانا مشکل نہیں— زیدی کے چہرے پر تبسم کا پردہ پھاڑ کر اداسیاں اور مایوسیاں جھلکنے لگیں— 'سوچا مت کیجیے آپ خوش اور بے فکر رہنے کی کوشش کیجیے'— اور نرسیں استراحت کے گھنٹوں میں تاکید کرتیں۔'خالی الذہن ہو کر آرام کیجیے۔'— آرام! آرام کے خیال ہی سے شیما کی روح بے قرار ہو گئی، سینہ پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔تڑپ کر کروٹ بدلا اور کھانستے کھانستے بے دم ہو گئی— پل میں اگال دان تازہ تازہ خون سے بھر گیا اور شیما لاش کے مانند بستر پر گر گئی۔

دور آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے نغمے فضا میں ارغنوں کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے اور تاریک رات کا سینہ صبح کاذب کی سپیدی سے چاک ہو رہا تھا۔

☐☐☐

فرہنگ آصفیہ سے

عَرفہ۔ع۔اسم مذکر۔ (۱) ماہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ جس میں حاجی لوگ عرفات میں جا کر کھڑے ہوتے ہیں اور لبیک پکارتے ہیں۔

حاجیو ہے آج عرفہ کچھ تکلّف ہے ضرور
بادۂ گلگوں سے رنگ لو جامۂ احرام کو (ناسخ)

(۔ا) ہر ایک تہوار کا پہلا دن جس میں بچوں کو عیدیاں دیکر چھٹی دے دیتے ہیں (عیدالاضحیٰ۔ عیدالفطر۔ محرم کی دسویں۔ اور شب برات سے ایک روز پہلے کا دن)۔ نہم ماہ محرم (۔ا) کسی شخص کے مرنے کے بعد جو عرفہ واقع ہو۔ اس میں مردے کی فاتحہ دلوانا۔ یہ لفظ اگرچہ بسکون ثانی غلط اور عربی میں پچھلے دو معنوں میں نہیں آتا مگر اس صورت میں اردو قرار دینا چاہئیے کیونکہ بعض شعرا مثل ناسخ وغیرہ نے بھی بسکون دوم باندھا ہے۔

افسانہ

کلنک

سرلا دیوی

شمشان میں مٹی کے بیکار تودوں کی طرح تمام قصبہ دوپہر کی گرمی میں خاموش پڑا لرز رہا تھا۔ آشا اپنے مکان کی سب سے اونچی چھت پر بیٹھی ہوئی افق تک پھیلے خشک مٹیالے کھیتوں میں ناچتے بگولوں کو دیکھ رہی تھی۔ قصبہ کے ایک کونے پر آسمان میں بہت سے چیل کوے منڈلا رہے تھے اور وہاں سے ڈھول نقاروں کی گھٹی گھٹی آوازیں کبھی کبھی ابھر کر سنائی دے جاتی تھیں۔

'آج رمیش کی شادی ہے۔ ان منڈلاتی چیلوں کے نیچے وہ نوشہ بنا بیٹھا ہوگا'۔— آشا نے ادھر سے منہ ہٹا لیا۔ سورج کی گرمی سے پیپل کے پتے مرجھا کر مردوں کی ہتھیلیوں کی طرح اُداس لٹک رہے تھے اور پیڑ پر ایک کوا زور زور سے کائیں کائیں کر رہا تھا۔ 'پٹ'— یکا یک مٹھائی کا ایک ٹکڑا آشا کے سامنے چھت پر آ گرا۔ اور ایک چیل فوراً ہی جھپٹ کر اسے اڑا لے گئی۔ 'رمیش کی شادی کی مٹھائی کا ٹکڑا'— اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں آشا کو محسوس ہوا کہ سینے میں متلی کے ہلکے ہلکے بگولے چکرا رہے ہیں اور پسینے چیونٹیوں کی طرح جسم پر رینگ رہے ہیں 'ارے تیرے تو پیٹ میں بچہ ہے'— پیپل پر کائیں کائیں کرتا کوا ڈاکٹرنی کے الفاظ کو طشت از بام کر رہا تھا۔ 'ہاں میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ جس کا تعلق اس مٹھائی کے ٹکڑے کی طرح رمیش سے ہے'— یکا یک آشا کا کلیجہ ایک بھیانک تخیل کی دھمک سے دہل اٹھا۔ 'ابھی تک بچے کی بات کوئی نہیں جانتا۔ مگر کل جب......'' اور پسینے کی موٹی بوندیں ننھے آبلوں کی طرح اس کی پیشانی پر چھلک آئیں!...... اور اس رات جب جاڑا کہرے اور دودھیا چاندنی میں گھل کر لان پر اوس کے قطروں میں ڈھل رہا تھا اور نارنگی کے جھنڈوں میں چٹختی ہوئی کلیوں نے اپنی خوشبو سے فضا میں خاموش جھنکاریں پیدا کر دی تھیں گو رات رانی کے کنج کی اوٹ میں وہ رمیش کے آغوش میں پڑی تھی.......... اب وہ سوچ رہی تھی۔ اس رات کے نیلے کہرے اور ان چکراتے بگولوں میں۔ اس رات کی خنک چاندنی اور اس چلچلاتی دھوپ میں۔ لان کی تازہ اوس اور پیشانی کے ان پسینوں میں۔ اس رات کی شرابی دھڑکنوں اور کلیجہ کی اس دہل میں کتنا بھیانک فرق ہے۔ ان دو حدود کے درمیان اس کی زندگی نے کس قدر بھیانک کروٹ لی ہے۔ آشا کا سر چکرا اٹھا۔

اس رات رمیش کے پاس سے آنے کے بعد تمام رات وہ ایک انجان لذت، ایک ناقابل برداشت نشہ کی وجہ سے سونہ سکی تھی۔ ذہن پر نشہ آور خواب کہرے کی طرح چھائے ہوئے تھے، مگر سویرا ہوتے ہی اس نشہ کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ لان میں اسی رات رانی کے کنج کے قریب محلے والے جمع تھے۔ 'کہیں رات کا راز کسی پر افشا تو نہیں ہوگیا؟'— مگر ایک بچہ کی چیخ نے اسے سہارا دیا۔ کمرے سے باہر آ کر اس نے دیکھا— لان کی ہری گھاس پر ایک نوزائیدہ بچہ ننگا پڑا بلک رہا تھا اور خون اس کے گرد لال چیتھڑوں کی طرح پڑا تھا۔ 'ارے اس حرام زادی کو اپنا کلنک پھینکنے کے لیے یہی جگہ ملی تھی۔' اس کی ماں بلند آواز میں کہہ رہی تھی۔ کوئی عورت اپنے نوزائیدہ بچہ کو لان پر پھینک گئی تھی۔

'اجی دیکھئے۔ بچہ کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ جسم سے لپٹا ریشمی رومال یہی ظاہر کرتا ہے۔' اس کے والد کہہ رہے تھے اور محلے کے پنڈت جی رام نام پڑھ کر اعلان کر رہے تھے۔

'اجی یہ آج کل کے لڑکے لڑکیاں پڑھ کر اور سیکھتے ہی کیا ہیں؟ یہ انگریزی تعلیم......'

اور کلنک کا نشان پڑا چیخ رہا تھا۔ لیکن یہ بچہ آخر اس طرح پھینکا کیوں گیا؟ کیا اس کی ماں کے سینے کا دودھ خشک ہو گیا تھا؟ کیا اس کے باپ کے پاس پرورش کے لیے پیسے نہ تھے؟ کیا اس بچہ کی معصومیت چھلکتے ہوئے ہاتھوں کو اسے سینے سے لگا لینے کے لیے مجبور نہ کر سکی؟— آشا کے ذہن میں ایک ساتھ یہ سوالات اٹھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں لال پگڑی والے سپاہی آ گئے اور بچہ کا بڑے غور سے معائنہ کرنے لگے۔ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پولیس والوں کی رہبری کرنے والے ساٹھ سال کے سیٹھ ہری چند کہہ رہے تھے۔ 'بچہ کو غور سے دیکھیے............باقی یہ آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں......'

اور غیر شعوری طور پر آشا کے دل میں آیا کہ ان تمام آدمیوں کے منہ نوچ ڈالے اور ناک پر انگلیاں رکھ کر آنکھیں مٹکاتی عورتوں کی چٹلیاں نکالے۔ 'تنقید اور تبصرہ آرائی کے بجائے یہ لوگ اس بچہ کو کیوں نہیں اٹھا لیتے۔ اور یہ سیٹھ جی......'

آشا کا تمام غصہ ان سیٹھ جی پر برس پڑا۔ 'آخر یہ سیٹھ جی اس بچہ کو اٹھا کر گھر کیوں نہیں لے جاتے؟— خاندان چلانے کے لیے یہ ایک لڑکی اگلے مہینے خرید کر لا رہے ہیں۔ کیا یہ بچہ ان کے خاندان کو نہیں چلا سکتا؟ کیا مستقبل قریب میں ان کی موت کے بعد اس لڑکی کی تاعمر بیوگی ہی ان کے خاندان چلانے کے لیے ضروری ہے؟' آشا کے خیالات ایک لمحہ کے لیے اس نوجوان لڑکی کی طرف منتقل ہو گئے جس کو بیاہ کر سیٹھ جی لانے والے تھے، ماں باپ کے دروازے بند پا کر بھوک، عصمت دری اور موت کے دہانے کھلے پا کر وہ لڑکی خود کو سیٹھ جی کی آغوش میں ڈال دے گی۔ تب ایک طوائف کی طرح وہ اپنا بدن ان سیٹھ جی سے کچلوائے گی۔ ان کی دھندلی آنکھوں میں اپنے جذبات کی نئی لو کو ہمیشہ کے لیے بجھا دے گی۔ اس کی آرزوئیں اس ناجائز بچے کی طرح ہمیشہ کے لیے ممنوعہ اور ناجائز قرار دے دی جائیں گی۔ ان حالات میں پیدا ہونے والا بچہ کیا 'جائز' کہلانے کا حق دار ہوگا؟ کیا وہ بچہ پھر ناجائز نہیں ہوگا؟ اس کی ماں اس بچہ کی ماں کی طرح کلنکنی اور باپ بدمعاش نہیں ہوگا؟ محض اس لیے کہ پنڈتوں اور کمینوں کو چند آنے رشوت کے مل جائیں گے وہ بچہ جائز ہو جائے گا— آشا کا چہرہ انگاروں کی طرح دہک اٹھا۔ بچہ اب روتے روتے تھک گیا تھا۔ صرف سردی سے ٹھٹھر کر کبھی کبھی سسک اٹھتا تھا۔

پولیس والے لوٹ گئے اور اپنے ساتھ یتیم خانے والوں کو لے کر دوبارہ آ پہنچے۔ یتیم خانے والوں نے بچہ کو ایک کمبل میں لپیٹا اور اٹھا کر لے جانے لگے۔ آشا کے جی میں آیا وہ زور سے چیخ پڑے۔ بچہ اب یتیم خانے میں پلے گا...... وہیں بڑا ہوگا۔ اور جب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ بینڈ کے ساتھ گا سکے اور راہگیروں سے بھیک مانگ سکے تب اس کے سر پر پیلی ٹوپی منڈ دی جائے گی۔ نازک کندھوں پر بینڈ کی پیٹی چڑھا دی جائے گی۔ ہاتھ میں مقفل صندوقچی پکڑا دی جائے گی اور تب شہر کی سڑکوں پر قصبوں کے محلوں میں بینڈ بجا کر وہ گاتا پھرے گا۔ 'یہ غم کی کہانی ہے سن لیجیے۔' 'اے سیٹھ جی ایک پیسہ' 'اے مائی ایک پیسہ۔' 'اجی حرام خوروں سے محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرا نہیں جاتا۔' لوگ کہتے گزر جائیں گے اور شام کو جب وہ منیجر کے سامنے خالی ہاتھ لوٹے گا۔ تو اس کی روٹی بند کر دی جائے گی۔ 'پیسہ مانگا بھی نہیں جا سکتا! جاؤ آج کی روٹی بند۔' کھڑے کھڑے آشا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک گئے۔ انسانیت کے ایک جز کو ایک نفس کو آج ناجائز کہہ کر فقیر اور گداگر بنایا جا رہا ہے۔ کل فقیر اور حرام خور کہہ کر ٹھکرا دیا جائے گا اور پرسوں وہ تمام رات بھوکا تڑپ کر کسی کو پکارنا چاہے گا۔ مگر کسی کو قریب نہ پا کر خود ہی روتے روتے سو جائے گا۔ اور پھر صبح کو— 'ہم اناتھ یتیم'

اس رات جب اس کی ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو وہ خود کہنے لگی۔ 'ان دونوں کا کیا بگڑا۔ اگر کچھ بگڑا تو ننھی سی جان کا۔ لڑکے نے کہیں شادی کر لی ہوگی۔ لڑکی رو پیٹ کر بہانے بنا کر شادی کر لے گی اور بس— مگر ماں کا کلیجہ بھی تو اس بچہ کو پھینکتے وقت پتھر ہو گیا تھا— عورت نہیں کوئی چڑیل ہوگی۔' اور آشا نے بھی سوچا یہ تمام قصور اسی عورت کا تھا۔

ایک دن اسکول جاتے اس نے دیکھا۔ سڑک کے کنارے تین چار بچوں کے درمیان ایک بھکارن پڑی چلا رہی تھی 'میم صاحب ایک پیسہ' رانی صاحب ایک پیسہ' آشا جل اٹھی۔ 'اگر بھوکی مرتی ہے تو بچے کیوں پیدا کرتی ہے۔ بے شرم'۔ مگر وہ صرف ایک بھکارن تھی—

'رانی صاحب۔ میرا آدمی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ان بچوں کی محبت مجھے تو تھی۔ ان کو چھوڑ کر مزدوری کرنے کیسے جاتی۔ ابھی جسم پر ماس ہے۔ لوگ جاتے جاتے۔ روٹی دیے جاتے ہیں اور ساتھ میں ایک بچہ بھی۔' آشا نے غور سے دیکھا— چیتھڑوں سے اس کا ابھرا ہوا پیٹ جھانک رہا تھا۔ 'ارے کیا تیرے بچہ ہونے والا ہے۔' شیلا چونک اٹھی۔

اور پھر وہ تمام دن سوچتی رہی اس لغو مہمل فقرہ کے معنی— ماں کی محبت، ماں کا کلیجہ— آدمی کے دھوکا دے جانے پر اس عورت نے بچہ کو لائن میں پھینک کر بہت ہی اچھا کیا، وہ بیچاری کہاں تک ان ذلیل آدمیوں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ 'جب یہ محبت کرتے ہیں تو اس کا ثمر ایک ناجائز بچہ۔ جب یہ رحم کھا کر ایک غریب ماں کو روٹی دیتے ہیں۔ تو اس کی قیمت ایک بھکاری بچہ— آشا بہت عرصہ تک سوچتی رہی، یہ ذلیل غدار انسان کس وقت تک اپنی ہی نسل کو طوائفوں فقیروں اور یتیموں میں تبدیل کرتا رہے گا۔

آشا کو وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ بنگال گئی تھی۔ قحط پورے زوروں پر تھا۔ سیکڑوں مائیں طوائفیں بن گئیں۔ آدمی

فقیر بن کر لقمۂ اجل بن گئے اور کلکتہ کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو زمین پر پٹک کر چلے جا رہے تھے۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو فروخت کر رہے تھے اور آشا نے سوچا۔ 'یہ بچے تو ناجائز نہیں ہیں ان کی ماؤوں کے کلیجے تو پتھر کے نہیں ہیں۔ ان کے باپوں نے تو ان کی ماؤوں کو دھوکا نہیں دیا۔ پھر یہ بچے سڑکوں پر کیوں پڑے ہیں؟ فروخت کیوں کیے جا رہے ہیں؟ ان کو تو سماج کا کوئی خوف نہیں۔ پھر یہ کیوں؟— 'روٹی اور پیٹ' بنگال کا سوال اور جواب یہی تھا اور اس وقت اسے معلوم ہوا۔ دھوکا۔ سماج کا خوف۔ ناجائز اور کلنک محض اس حالت کا نام ہے۔ جب پیٹ بھوک پکارتا ہے اور ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ انسان کی تہذیب، اس کا اخلاق، اس کی محبت خود اس چیز کے محتاج ہیں جس کو روٹی کہتے ہیں۔

کئی دنوں سے آشا کا بدن ٹوٹا جا رہا تھا۔ گیلے آٹے کی طرح اس کا تمام جسم کچا کچا معلوم دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور دل یوں ہی بار بار بری طرح دہل اٹھتا تھا۔ گویا اس کا جسم ایک بوسیدہ پرانی قبر بن گیا تھا— اور ایک دن جیسے قبر دھم سے بیٹھ گئی۔

'ارے آشا تو نے یہ کیا ناش کر ڈالا۔ تیرے پیٹ میں تو بچہ ہے۔' اس کی دوست ڈاکٹرنی چلا اٹھی.........

'رمیش اب تم ہی میری عزت اور زندگی بچاؤ.........'

'آشا میں بڑا شرمندہ ہوں۔ تم جس ڈاکٹر کی مدد لینا چاہو تو میں خرچ ادا کردوں گا مگر شادی...... دیکھو میرے والد کی ناک.......... اور زبردستی انھوں نے میری شادی طے کر دی ہے........... دیکھو میں واقعی کتنا مجبور ہوں ورنہ......'

آشا نے اس کی طرف دیکھا — رمیش...... محبت...... وہ ...... دو انسانوں کے درمیان ایک رشتہ۔ فریب...... ناجائز بچہ...... کچی محبت— دو انسانوں کے درمیان ایک معصوم انسان کی تباہی! اور ایک لمحہ کے لیے اس کی خواہش ہوئی کہ وہ رمیش کے گلے میں اپنا آنچل ڈال کر اسے زور سے کھینچے کہ...... مگر دوسرے لمحے اسے یاد آ گئی انسانوں کی وہ تصویر جو اس نے بنگال میں دیکھی تھی۔ اس آدمی کو اس نے کتوں کی طرح ایک دوسرے سے روٹی ٹکڑے پر لڑتے مرتے دیکھا تھا— دن کی روشنی میں۔ ایک اعلیٰ پیمانہ پر۔ پھر وہ کیا پروا کرے گا اس عورت کی جو خود دنیا کی نظروں سے چھپنا چاہے گی۔ اس بچہ کی جو ابھی پیدا نہیں ہوا—

'جاؤ رمیش شادی کر لو۔ باپ کی ناک برقرار رکھو، اور جب میں ایک بھکارن بن کر سڑک پر تم سے پیسہ مانگوں تو اپنے ہونے والے بچہ کی طرف اشارہ کر کے کہنا— 'ابے بچہ پیدا کیوں کرتی ہے۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے!!'

اور بھورے خشک کھیتوں میں ایک بگولہ ہمہ تن رقص آسمان کو چڑھ رہا تھا۔ ایک زخمی گدھا اپنی پیٹھ کے زخم سے ایک کوے کو اڑانے کی کوشش میں رینگ رہا۔ آشا ایک گاڑی میں پڑی ہوئی اپنی ماں کے ساتھ اپنے 'کلنک' کو دھونے کے لیے کسی دور کے گاؤں میں جا رہی تھی۔ 'نہ جانے بچہ لڑکا ہو گا یا لڑکی'— ایک لمحہ کے لیے وہ جذباتی ہو اٹھی۔ مگر........... آسمان میں بہت سے چیل کوے منڈلا رہے تھے۔ اور اس کی ماں گرمی سے پریشان ہو کر کہہ رہی تھی۔ 'بالے تو نے سارے خاندان کی ناک کاٹ ڈالی— ورنہ ایسی آگ برستی دوپہر ہی میں یوں کیوں اپنی تقدیر پھوڑتی ہوتی۔' اور معصوم گاڑی وان باتوں کے سلسلہ کو گرمی کی شدت پر محمول سمجھ کر کہہ رہا تھا۔ 'مائی گھبراؤ مت چیلیں منڈلا رہی ہیں۔ جلد ہی بارش ہو جائے گی۔' اور آشا کی آنکھ سے ایک سہما سا آنسو کھسکا اور پسینے میں گھل کر آہستہ آہستہ بہنے لگا۔

□□□

فرہنگ آصفیہ سے

شب برات ۔ف۔ اسم مؤنث۔ مرکب از (شب۔ برات) (ماہ شعبان کی چودھویں اور بعض کے نزدیک پندرہویں رات جس میں ملائکہ بحکم الٰہی رزق کی تقسیم اور عمر کا حساب لگاتے ہیں۔ اس تاریخ میں مسلمان لوگ اپنے اپنے مردوں کو فاتحہ دلاتے روشنی کرتے آتشبازی چھوڑتے اور حلوا پوری پکا کر باہم بانٹتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی نیاز دلوائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جب رسول مقبول نے جنگ احد فتح کر کے اپنے یاروں کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے تو دیکھا کہ ہر ایک اپنے اپنے مردوں کی تعزیت کرتا روتا اور فاتحہ دلواتا ہے۔ حضرت نے یہ حال دیکھ کر فرمایا۔ افسوس امیر حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔ انصار نے یہ سن کر اپنی عورتوں کو امیر حمزہ کے گھر بھیجا تاکہ ماتم داری کریں۔ شام سے آدھی رات تک انہوں نے ان کا ماتم کیا اور مرثیہ پڑھتی رہیں۔ چنانچہ اب تک اہل عرب میں یہی دستور ہے کہ کوئی کسی مردے کی تعزیت کو کیوں نہ آئے مگر اول حضرت امیر حمزہ کی تعزیت کرے گا۔ شب برات کی فاتحہ کا دستور بھی انہیں سے منسوب کرتے ہیں چونکہ یہ ایک خوشی کا تیوہار خیال ہونے لگا ہے اس وجہ سے رات کی خوشی کو شب برات اور دن کی خوشی کو عید سے تعبیر کیا کرتے اور آتش بازی چھوڑتے ہیں جیسے ان کے ہاں دن عید اور رات شب برات ہے یعنی رات دن خوشی حاصل ہے

کیوں ہیں اشک اپنے پھلجھڑی کی طرح
شب فرقت شب برات نہیں (ناسخ)

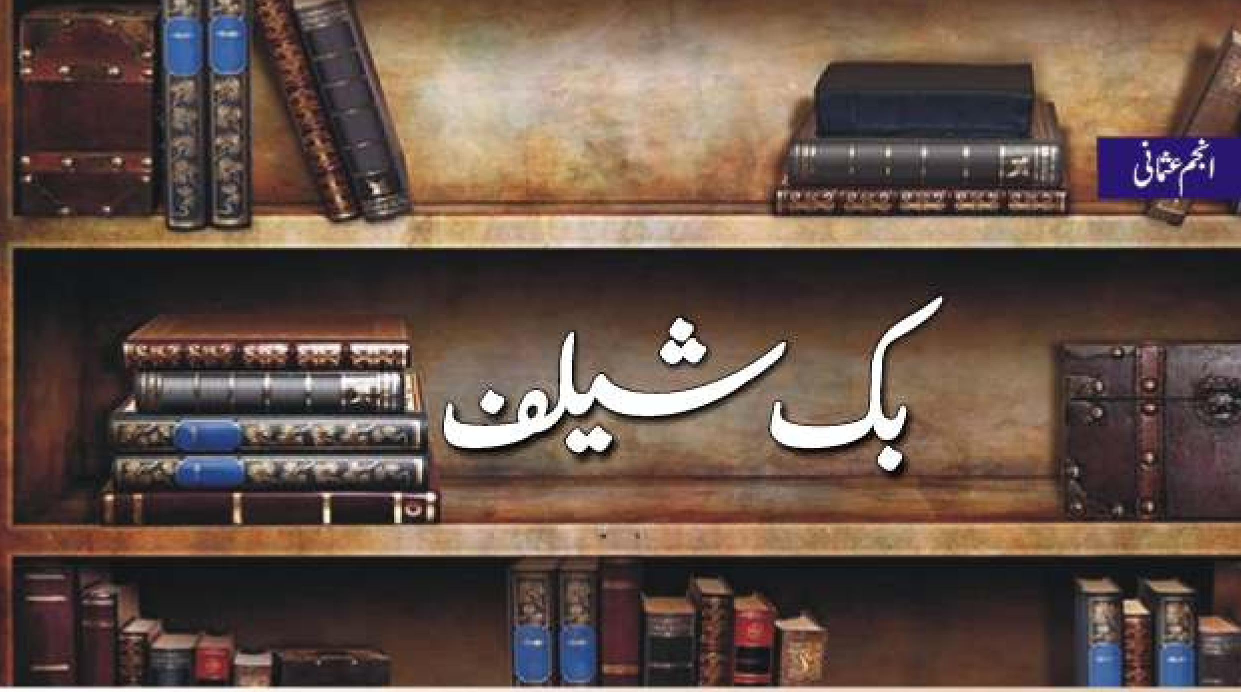

بک شیلف

انجم عثمانی

رات کے پہلے پہر میں وہ دفتری سفر سے گھر لوٹا تو کافی سامان نئے مکان کے باہر لان میں پڑا ہوا تھا۔ جب وہ ٹور پر جا رہا تھا تو اس نئے مکان میں شفٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ چاہتا تو وہ یہی تھا کہ پرانے مکان سے پوری طرح نئے مکان میں منتقل ہونے تک ٹور تو کیا وہ آفس بھی نہ جائے اور اس نے کچھ دن کی چھٹی لے بھی لی تھی مگر کسی دفتری مجبوری کی وجہ سے اسے چھٹی منسوخ کر کے اچانک سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ ملازمت بہر حال ملازمت ہے، چاہے وہ افسری کیوں نہ ہو، چنانچہ جاتے جاتے وہ اہلِ خانہ سے کہہ گیا تھا کہ شفٹنگ کا کام جاری رکھا جائے، وہ ایک دو دن میں آ ہی جائے گا، اور ہوا بھی ایسا ہی اور جب وہ سفر سے لوٹا تو اس نئے مکان کے لان میں کئی دوسری چیزوں کے ساتھ اس کی وہ بک شیلف بھی رکھی تھی جسے اس نے ہمیشہ اپنی مختصری لائبریری کے طور پر سجوئے رکھا تھا۔

وہ ایک پرانا سرکاری ملازم تھا، اب ریٹائرمنٹ کے قریب تھا مگر سرکاری ملازمت کی ساری مدت میں وہ کیسے بھی چھوٹے سے چھوٹے مکان میں رہا ہو، کتابوں کا یہ شیلف ہمیشہ مکان کے اہم کونوں میں جگہ پاتا رہا تھا۔ کتابوں کے اس ستھرے ذوق نے ہی غالباً اس کو فائلوں کے بے جان کاغذوں اور دفتر زدہ جسموں کے درمیان سالہا سال گھرے رہنے کے باوجود باطنی طور پر خود کو زندہ رکھنے میں مدد کی تھی، اس میں ابھی تک وہ گوشہ محفوظ تھا جس میں جذبہ، تہذیب اور تربیت سانس لیتے ہیں۔ اسے یاد تھا کہ قصبے کے بڑے سے گھر کے چھوٹے بچے جب خود مدرسے جانے کے لائق ہو جاتے تو اونچی دیواروں والے دالانوں میں بنی چھوٹی چھوٹی سی الماریوں میں سے ایک الماری، جسے ان کے یہاں کھڑکی کہتے تھے، اس بچے کے اختیار میں دے دی جاتی۔ یہ چھوٹی سی الماری اس کی پوری دنیا بن جاتی وہ اسے صاف کرتا، سجاتا اور اپنا قاعدہ، کاپی قلم اور بہت سی ایسی چیزیں جنھیں وہ اہم سمجھتا اس میں رکھتا تھا۔ کچھ اور بڑی کلاسوں میں جاتا تو اسے گھر میں بڑی الماری مل جاتی اور بالغ ہو کر الگ ایک کمرہ مل جاتا گویا معاشرتی تربیت تھی جو مرحلہ وار طے ہوتی۔

سرکاری ملازمت کے سلسلے میں شہر آ کر اسے پڑھنے کے لیے الگ کمرہ تو در کنار کبھی الگ سے کوئی گوشہ بھی میسّر نہیں ہوا مگر اس نے اس بات کا اہتمام رکھا کہ اسے اپنے لیے جو گوشہ بھی میسّر آئے اس میں کتابوں کے اس شیلف کو ایڈجسٹ کرے اور اب تو خیر سینئر ہونے کے ناطے اسے اچھا خاصا بڑا مکان ملا تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی ایک بڑی سی الماری خریدے گا اور باقاعدہ اپنا اسٹڈی روم بنائے گا مگر بڑا مکان ملنے پر اس کے چھوٹے سے بک شیلف کو غیر ضروری سامان کی فہرست میں ڈال دیا گیا تھا اور اب رات کی نیم تاریکی میں نئے مکان کے لان میں ایسے رکھا تھا جسے رکھا ہوا نہیں پڑا ہوا کہتے ہیں۔

”کیسا رہا آپ کا سفر؟“ کھانے کی میز پر اس کے سامنے کھانا پروستے ہوئے اس کی بیوی نے پوچھا۔

”سرکاری ٹور سب ایک جیسے ہوتے ہیں بس وہی روٹین ورک۔ نئے مکان میں شفٹنگ میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ سجاوٹ کیسی لگی آپ کو؟“

کافی اچھی ہے، بس کچھ چیزوں کو شاید ایڈجسٹ نہیں کیا جا سکا۔“

”ہاں اصل میں بچے کچھ نئی چیزیں خرید لائے تھے اس لیے کچھ

چیزوں کے لیے جگہ نہیں بچی۔‘‘

’جو چیزیں ایڈجسٹ ہونے کی طاقت نہیں رکھتیں، وہ کہاں جگہ بنا پاتی ہیں۔اس کا دل چاہا زور سے چلاّ پڑے اور مکان میں موجود لوگوں کو بتائے کہ کتنے سال سے وہ سب کو ایڈجسٹ کیے ہوئے ہے۔اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید تم یہ نئی چیزیں خریدنے کے لائق ہی نہ ہوتے، مگر وہ خاموشی پسند ایک صلح کل شخص تھا۔ایک خاص تہذیب کا پروردہ ہونے کی وجہ سے بہت مرتبہ اس کا ردِعمل عام لوگوں سے مختلف ہوتا تھا۔اس نے خاموشی سے کھانا کھایا اور اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے کمرے کی کھڑکی اسی لان میں کھلتی تھی جہاں دوسری چیزوں کے ساتھ اس کی بک شیلف بھی پڑی ہوئی تھی۔اس نے ارادہ کیا کہ ابھی کے ابھی لان میں سے کتابیں لا کر اپنے کمرے میں کچھ جگہ بنا کر صحیح جگہ رکھ دے، مگر بیچ رات میں سامان ادھر سے ادھر کرنا اور سب کو جگانا اسے مناسب نہ لگا۔وہ سونے کی کوشش کرنے لگا مگر سفر کی تھکان کے باوجود اسے نیند نہ آئی۔اس نے کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا، اسے محسوس ہوا کہ اس کے بچپن کے کچھ دوست، اس کے کئی محسن رات میں گھر کے باہر کھڑے اس کو عجیب نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔کئی کتابوں کے کردار شیلف سے باہر نکل آئے تھے اور اس سے استفسار کرنے لگے تھے:

’’کیوں جناب بس ہو چکی دوستی، ایک تو ایسے موقع پر ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے جب ہماری جگہ بدلی جا رہی تھی اور اب کیسے آرام سے نئے مکان میں بستر پر دراز ہیں اور ہم یہاں لان میں ٹھٹھر رہے ہیں۔‘‘

کسی کردار نے اس کی وِنڈو تھام لی تھی، کوئی کہہ رہا تھا ’ہم نے تمھاری اداسیوں، تمھاری تنہائیوں میں تمھارا کتنا ساتھ دیا مگر تم......‘

’مجھے تو تم جانتے ہونا، مجھ سے تو تمھیں لگ بھگ عشق تھا‘، کہانی کی ایک ہیروئن نے اسے یاد دلایا، ’تم نے میرے نام پر اپنی بچی کا نام تک رکھ دیا، مگر....‘

رات کا آخری پہر ہو چکا تھا، نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔بے قراری کے اسی عالم میں اس نے صبح کی۔

اگلی صبح لوگوں نے دیکھا کہ وہ گھر کے باہر لان میں رکھے بک شیلف میں سے کتابیں اس طرح منتقل کر رہا ہے جیسے کسی کی انگلی تھام تھام کر اندر لا رہا ہو۔اس کے چہرے کے تاثرات نے کسی کو جرأت نہ ہونے دی کہ اس سے کچھ سوال کر سکے۔

شیلف سمیت ساری کتابیں اندر لا کر وہ آرام سے کرسی پر آ کر ایسے بیٹھ گیا جیسے اس کے کمرے میں اس کی پسند کے بہت سے دوست جمع ہوں۔سفر کی تھکان اور نیند کا خمار اس کی آنکھوں سے غائب تھا، اس نے کھڑکی میں سے کمرے کے باہر نظر ڈالی جہاں دو نوجوان ایک پرانے اسکوٹر پر ایک بڑا سا ٹی وی سیٹ ڈھوئے لے جا رہے تھے۔

اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ چمکی۔بہت اطمینان کے ساتھ اس نے شیلف سے ایک کتاب نکالی، اس پر ایسے ہاتھ پھیرا جیسے کسی بے تکلف دوست سے ہاتھ ملا رہا ہو اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

□□□

Anjum Usmani
C-22, Okhla Vihar
Jamia Nagar
New Delhi-110025

فرہنگ آصفیہ سے

عقیقہ ۔ع۔اسم مذکر۔ لغوی معنی پیٹ کے بال۔ یعنی وہ بال جو بچے کے سر پر پیٹ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ مونڈن۔ سر مونڈنے اور نام رکھنے کی تقریب جو یوم ولادت کے ساتویں دن ہوتی ہے۔چونکہ اس تقریب میں بچے کے بال منڈوائے جاتے ہیں اور ان کے برابر چاندی حجام کو دی جاتی ہے اور حسب شرع بکرے ذبح کر کے ضیافت کھلائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس تقریب کا نام عقیقہ ہو گیا ۔اس رسم میں حسب شرع بیٹے کے واسطے دو بکرے اور بیٹی کے لئے ایک بکرا بہ صفات معہودہ ذبح کیا جاتا ہے جس کے حلال کرنے سے یہ غرض ہوتی ہے کہ بچے کے بالوں کے عوض بال گوشت کے عوض گوشت ۔پوست کے عوض پوست علیٰ ہذا القیاس ۔ تمام جسم کی چیزوں کی بجائے تمام چیزیں صدقہ میں دی گئیں تاکہ وہ آفات دنیوی سے محفوظ رہے۔

عقیق ۔ع۔اسم مذکر۔ ایک سرخ رنگ کا پتھر جس پر اکثر مہریں کھودتے یا انگوٹھیوں میں لگاتے ہیں۔سرخی کے باعث لب معشوق کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آگ کا اس پر کم اثر ہوتا ہے

آویزہ تیرے گوش کا ہوا اس امید پر
کیا کیا عقیق کان یمن سے نکل گیا (آتش)

لگاؤ

ترنم جمال

میں نے ابھی آٹو سے چاندنی بازار اتر کر نیو مارکیٹ جانے والے راستے پر قدم بڑھایا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرا آنچل کھینچ لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک چھ سات سال کی بچی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑے، بال بکھرے ہوئے۔ وہ بولی' آنٹی صبح سے بھوکی ہوں کھانا کھلا دو۔ میری ماں نے بھی کچھ نہیں کھایا ہے۔'

'لیکن تمھاری ماں کہاں ہے' میں نے اطراف میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

'وہ سڑک کی دوسری طرف بیمار پڑی ہے۔ میں نے پرس سے پچاس کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔' اپنے لیے اور ماں کے لیے کھانا لے لینا۔'

اور میں آگے بڑھ گئی۔ مجھے پہلے ہی کافی دیر ہو گئی تھی۔ ٹریز رلینڈ سے بچوں کے لیے اسکول یونیفارم لینا تھا۔ گھر میں اپنے تینوں بچوں کو چھوڑ کر آئی تھی۔ بڑے دونوں بھائی بہن کو کہہ دیا تھا کہ چھوٹی بہن کا خیال رکھے۔ رحمٰن اسٹور پہنچ کر میں نے اسکول یونیفارم لیے۔ پھر اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے خوبصورت فراک کی تلاش میں لگ گئی۔ کیونکہ میرا جب بھی نیو مارکیٹ آنا ہوتا میں اس کے لیے فراک ضرور خریدتی۔ پھر میں نے ایک بہت خوبصورت ریڈ کلر کا نیٹ ورک فراک لے لیا۔

مجھے معلوم تھا وہ کتنا خوش ہو گی۔ فرمائش کچھ نہیں کرتی۔ بھائی بہن کی چیزوں کو خاموشی سے دیکھتی ہے۔ لیکن جیسے ہی شاپر سے اس کے لیے کچھ نکلتا ہے۔ ہزاروں خوشی کے جگمگاتے رنگ اس کی پیاری سی من موہنی صورت پر آ جاتی ہے۔ اور اپنی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی ہے۔ دو یہ میرا ہے۔''میرا یہ۔ ممی میرے لیے لائی ہیں''اس کے پاپا بھی اس کی مسکراہٹ اور اس کے انداز پر فدا ہیں۔ یوں تو وہ انھیں ابا۔ ابا کہتی ہے لیکن پا۔ پا اپنے نازک لبوں سے اس انداز سے کہتی ہے۔ مانو گلاب کی پنکھڑیوں سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ وہ بہت خوش ہوتی ہے کہ میں نے پاپا کہا۔ کیونکہ بھائی بہن بھی پاپا کہتے ہیں۔

انہی خیالوں میں گھر پہنچتی ہوں۔ دونوں بچے اسکول کا ہوم ورک کر رہے تھے۔ میری چھوٹی بیٹی نیچے فرش پر بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے چیخنے لگی اور مجھ سے آ کر لپٹ گئی۔ جیسے کتنے دنوں کے بعد مل رہی ہو۔ اگر میں کبھی بھی باہر کچھ دیر کے لیے چلی جاؤں تو یوں اُداس ہو جاتی ہے اور آنے کے بعد اس طرح ملتی ہے جیسے کب کی بچھڑی ہوئی ہو۔

میں نے بھی گود میں اٹھا کر اسے پیار کیا۔ اور جتنے بھی لفظ پیار کے میری زبان سے نکلے۔ میں نے کہے۔ میری گڑیا، میری بیٹی، میری دنیا، میری دھڑکن۔ میری سب کچھ۔ اور شاپر سے نکال کر میں نے ریڈ فراک اسے پہنا دی۔ اور وہ اپنی بڑی امی کے روم میں چلی گئی۔ کیونکہ اسے سب سے پہلے ڈریسنگ ٹیبل میں آئینہ دیکھنا تھا۔ گھوم گھوم کر دائیں بائیں فراک پھیلا کر۔ اسے جب بالکل اطمینان ہو جاتا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے فراک اچھا ہے تو خوشی سے آئینے میں منہ سٹا کر خود کو پیار کرتی۔ چچازاد بہن سے موبائل سے تصویر کھنچواتی اور پھر اپنے کمرے میں آتی۔

میرے پیچھے پیچھے پورے گھر میں گھومتی ایک سیکنڈ کے لیے بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑتی۔ میں تھکن سے چور بستر پر لیٹتی، تب وہ اپنے نازک ہاتھوں سے میرا ہاتھ دباتی، سر دباتی، مجھ سے لپٹ کر میرا منہ چومتی اور میں اسے پیار سے کہتی۔

کیا بیٹی تم میرا منہ گندہ کر دیتی ہو۔ پھر وہ میرے ڈوپٹہ سے میرا منہ صاف کرتی۔ اور یوں میں اپنی ساری تھکن بھول جاتی اور اپنے بڑے

دونوں بچوں سے کہتی۔ دیکھ لو، بڑی ہو کر یہ میری زیادہ خدمت کرے گی۔ بھائی ہنس کر کہتا۔ 'امی یہ دکھاوا کرتی ہے۔ سب دکھاوا ہے۔' اور میں مسکرا دیتی بیٹے کی سادگی پر۔ میری بچی جسے 'دکھاوا' لفظ کا مفہوم نہیں معلوم وہ کیا دکھاوا کرے گی۔

اس کی زندگی میں ایک اور فرد کی بہت اہمیت ہے۔ جس کا ذکر نہیں کروں تو شاید یہ کہانی کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ یہ مخلص ہستی ہے میری آپا کی بیٹی۔ میں جب بھی اپنے والدین کے یہاں جاتی ہوں بچوں کے اسکول کی چھٹیوں میں، تو وہ بھی وہاں ہوتی ہے اور میں وہاں اپنی چھوٹی بیٹی کی ذمہ داریوں سے بالکل آزاد ہو جاتی ہوں۔ یہ ذمہ داری بحسن وخوبی وہ اٹھالیتی ہے۔ اسے ذرا بھی چوٹ تکلیف نہیں پہنچنے دیتی۔ بالکل پھولوں کی طرح رکھتی ہے۔ کہتی ہے 'گھر میں جتنے بچے بھی آجائیں 'میری بابو کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔'

میری بیٹی کے لیے اس کی محبت کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ شرارت کے طور پر ایک ویڈیو اسے بھیج دیا گیا جس میں میری بیٹی بہت رو رہی تھی اور اشارے سے کھانا مانگ رہی تھی۔ جسے دیکھتے ہی اس نے انتہائی غصے میں ہمیں فون کیا۔ اور زار و قطار رونے لگی۔ 'آپ لوگ کیوں میری بابو کو رلا رہی ہیں۔ اسے کھانے کے لیے کیوں نہیں دے رہی ہیں'۔ اور ہم سبھی کو اس کی نادانی پر خوب ہنسی آئی تھی۔

لیکن ہم میں سے شاید کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہ ہنسی، یہ خوشی بہت جلد ہمیشہ کے لیے روٹھ جائے گی۔ خوشیاں جس کی ذات سے تھیں، ہم سے یوں بچھڑ جائیں گی۔

آج بھی میں جب بھی نیو مارکیٹ جاتی ہوں تو حسرت بھری نگاہوں سے شاپ میں ٹنگی ہوئی خوبصورت فراکوں کو دیکھتی ہوں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نیند میں اس کے پاپا چیختے ہیں۔ بیٹی کا نام لے کر روتے ہیں۔ انھیں کیسے سمجھاؤں بیٹی وہاں چلی گئی ہے جہاں رونے اور چیخنے سے اگر واپس آجاتی تو شاید میں ان سے زیادہ چیختی۔ کیونکہ وہ میری رگ جاں کے قریب تھی۔ حالانکہ دو بچے اور بھی ہیں۔ لیکن انسیت اسی سے تھی۔ وجہ یہ بھی ہے کہ جسمانی طور پر وہ معذور تھی۔

□□□

Tarannum Jamal
26, Zakaria Street
Kolkata-700073 (W.B)

فرہنگ آصفیہ سے

شطرنج (معرب چترنگ) اسم مؤنث۔ ایک امیرانہ بازی کا نام ہے جس سے ذہن تصور عقل سوچ فکر حافظہ کو ترقی ہوئی اور ۳۲ مہروں کے ذریعہ سے کھیلی جاتی ہے۔

جہاں کو وضع جہاں پائمال رکھتی ہے
نئی طرح کی یہ شطرنج چال رکھتی ہے (اسیر)

اس لفظ کو اکثر اہل لغت نے بالکسر مگر بعض نے بالفتح بھی لکھا ہے۔ بالکسر لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ فعلن کے وزن پر کلام عرب میں کوئی لفظ بالفتح نہیں آتا۔ اس لفظ کی تحقیق میں صاحب بہار عجم لکھتے ہیں کہ یہ سترنگ کا معرب ہے جو ایک فارسی زبان کا لفظ مردم گیاہ کے معنی میں ہے۔ چونکہ یہ گھاس اور اسکی جڑ آدمی کی صورت سے مشابہ ہے اور اس کھیل کے اکثر مہرے انسان کے نام پر ہیں۔ لہذا مجازاً استرنگ کہنے لگے۔ بعض محققوں کی رائے ہے کہ یہ لفظ سنسکرت چتر انگ کا معرب ہے کیونکہ سنسکرت زبان میں چتر چار کو اور انگ جسم واعضا کو کہتے ہیں چنانچہ چترنگی اس فوج کو کہتے ہیں جس میں چار رکن یعنی ہاتھی گھوڑے رتھ اور پیدل ہوں مجازاً چار رکن۔ چونکہ اس بازی کے بھی شاہ وفرزیں کے علاوہ چار رکن سپاہ، گھوڑا، رخ، پیادہ ہیں لہذا یہ نام رکھا گیا۔ بعضوں کے نزدیک یہ لفظ شد رنج تھا یعنی رنج رفت کیونکر حالت فکر اور موقع رنج میں اس کھیل سے طبیعت بہل جاتی ہے۔ اور بعضوں نے صد رنگ کا معرب قرار دیا ہے۔ کیونکہ رنگ بمعنی حیلہ آتا ہے اور اس میں سینکڑوں حیلے کرنے پڑتے ہیں۔ صاحب فرہنگ رشیدی نے ایک جگہ شترنج بتائے قرشت لکھ کر اس کے معنی مختلف قسم کا ملا جلا غلہ قرار دئیے اور یہاں تک تصدیق پہنچائی ہے کہ اگر اس کی آش پکائیں تو آش شترنج کہتے ہیں اور اگر روٹی پکائیں تو نان شترنجی کہتے ہیں چنانچہ اوحدی شاعر کا شعر بھی اسکی مثال میں درج کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ شترنج اسی کا معرب ہے۔ بعضوں نے اس کی اصل ہندی شت رنگ لکھی ہے یعنی بہت سے رنگ والا کھیل کیونکہ شت زبان سنسکرت میں بمعنی صد آیا ہے۔ غرض اسی طرح جتنے منہ اتنی باتیں ہیں جن کی کیفیت بہار عجم سے معلوم ہو سکتی ہے۔

طوفان

خلیل جبران۔ترجمہ۔عزہ معین

یوسف الفاخری کی عمر تب تیس سال کی تھی، جب انھوں نے اس دنیا کو چھوڑ دیا اور شمالی لبنان میں وہ قدیسا کی گھاٹی کے قریب ایک پرسکون آشرم میں رہنے لگے۔آس پاس کے گاؤں میں یوسف کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں سننے میں آتی تھیں۔کئی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک جانے مانے خاندان کے چشم و چراغ تھے اور کسی حسینہ سے محبت کرنے لگے تھے جس نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔اسی لئے وہ زندگی سے مایوس ہو گئے اور انھوں نے اپنے لئے تنہائی کو منتخب کر لیا۔کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک شاعر تھے اور شور بھری بستیوں کو چھوڑ کر وہ اس سنسان جگہ پر رہائش پذیر تھے کہ یہاں سکون سے اپنے خیالات کو جمع کر سکیں۔یہاں اپنی خداداد صلاحیتو ں کو منظم کر سکیں۔وہیں کئی لوگوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ایک پراسرار شخص تھے اور انھیں روحانی مطالعہ میں ہی قرار ملتا تھا۔جبکہ زیادہ تر لوگوں کا یہ نظریہ تھا کہ وہ ذہنی طور پر کمزور تھے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، اس انسان کے بارے میں میں کسی حتمی فیصلہ پر نہ پہنچ پایا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی گہرا راز چھپا ہے، جس کا علم صرف قیاس آرائی سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ایک عرصہ سے میں اس انوکھے انسان سے ملنے کی سوچ رہا تھا۔میں نے متعدد اقسام سے ان سے دوستی کرنے کی کوشش کی، اس لئے کہ میں ان کی اصلیت کو جان سکوں۔اور یہ پوچھوں کہ ان کی زندگی کا المیہ کیا ہے، ان کی کہانی کو جان لوں۔لیکن میری سبھی کاوشیں ناکامی کا شکار ہوئیں۔جب میں پہلی بار ان سے ملنے گیا تو وہ لبنان کے مقدس دیوداروں کے درمیان جنگل میں اندر تھے۔میں نے انھیں منتخب الفاظ کی خوبصورت زبان میں انھیں سلام عرض کیا۔لیکن انھوں نے جواب میں زرا سا سر جھکایا اور تیز چلتے ہوئے آگے نکل گئے۔

دوسری بار میں نے انھیں آشرم کے ایک چھوٹے سے انگوروں کے باغیچہ کے درمیان میں کھڑا ہوا دیکھا۔میں پھر ان کے قریب گیا۔اور اس طرح سے کہتے ہوئے انھیں سلام کیا" گاؤں کے لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس آشرم کی تعمیر چودھویں صدی میں سیریا میں رہنے والے ایک برادری کے لوگوں نے کی تھی کیا آپ اس کی تاریخ کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

انھوں نے لاپروا انداز سے جواب دیا"میں نہیں جانتا کہ اس آشرم کو کس نے بنوایا اور نہ ہی مجھے یہ جاننے کی پروا ہے۔"انھوں نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور یوں گویا ہوئے" تم اپنے باپ دادوں سے کیوں نہیں پوچھتے، جو مجھ سے زیادہ بوڑھے ہیں اور جوان گھاٹیوں کی تاریخ کو مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔"

اپنی کوشش کو بالکل ہی بے کار سمجھ کر میں لوٹ آیا۔اس طرح دو سال بیت گئے۔اس منفرد انسان کی بے مقصد زندگی نے میرے ذہن میں گھر کر لیا۔اور وہ بار بار میرے خواب میں آ آ کر مجھے تنگ کرنے لگا۔

ستمبر نومبر کے مہینوں میں ایک دن، جب میں یوسف الفاخری کے آشرم کے پاس کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں گھومتا پھر رہا تھا، اچانک بہت تیز آندھی اور موسلا دھار بارش نے مجھے گھیر لیا اور طوفان مجھے ایک ایسی کشتی کی طرح ادھر سے ادھر بھٹکانے لگا جس کی پتوار ٹوٹ گئی ہو اور جس کا مستول سمندر کے طوفانی جھکوروں سے منتشر ہو گیا ہو۔بڑی مشکل سے میں نے اپنے پیروں کو یوسف صاحب کے آشرم کی طرف بڑھایا اور دل ہی دل

میں سوچنے لگا" بہت دن کے انتظار کے بعد یہ ایک موقع ہاتھ لگا ہے۔ میرے اندر جانے کے لئے طوفان ایک بہانا بن جائیگا اور اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے میں کافی وقت ان کے ساتھ کاٹ سکوں گا۔ جب میں آشرم میں پہنچا تو میری حالت بے حد قابلِ رحم ہوگئی تھی۔ میں نے آشرم کے دروازے کو کھٹکھٹایا تو جن کی کھوج میں میں تھا، انھوں نے دروازہ کھولا۔ اپنے ایک ہاتھ میں وہ ایک ایسے خستہ حال پرندہ کو لئے ہوئے تھے، جس کے سر میں چوٹ آئی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بس مرنے ہی والا ہے۔ اس کے پر کٹ گئے تھے۔ میں نے یہ کہہ کر ان کی توجہ حاصل کی کہ" براہ کرم میری اس بنا اجازت آمد اور تکلیف کے لئے معاف کیجئے۔ اپنے گھر سے بہت دور طوفان میں میں بہت بری طرح پھنس گیا تھا۔"

تیوری چڑھا کر انھوں نے کہا" اس سنسان جنگل میں متعدد گپھائیں ہیں جہاں تم پناہ لے سکتے تھے۔" لیکن جو بھی ہو انھوں نے دروازہ بند نہیں کیا میرے دل کی دھڑکن پہلے سے ہی بڑھنے لگی کیوں کہ جلد ہی میری سب سے بڑی تمنا پوری ہونے جا رہی تھی۔ انھوں نے پرندہ کے سر کو بہت ہی احتیاط سے سہلانا شروع کیا اور اس طرح اپنی ایک ایسی خوبی کو ظاہر کرنے لگے جو مجھے بہت پیاری تھی۔ مجھے اس انسان کو دو طریقوں سے آپس میں مخالف خوبیوں رحم دل اور مغروریت کو ایک ساتھ دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا۔ ہمیں علم ہوا کہ ہم گہری بے حسی کے درمیان کھڑے ہیں۔ انھیں میری وہاں موجودگی پر غصہ آ رہا تھا اور میں وہاں ٹھہرے رہنا چاہتا تھا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انھوں نے میرے خیالات کو پڑھ لیا تھا کیوں کہ انھوں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا" طوفان صاف ہے اور کھٹا (برے انسان کا) گوشت کھانا نہیں چاہتا۔ تم اس سے بچنا کیوں چاہتے ہو؟

کچھ ظرافت سے میں نے کہا" ہو سکتا ہے، طوفان کھٹی اور نمکین چیزیں نہ کھانا چاہتا ہو لیکن ہر چیز کو وہ ٹھنڈا اور بے بس بنا دینے پر تلا ہے اور بلاشبہ یہ کہ وہ مجھے پھر سے پکڑ لے گا تو اپنے میں سمائے بنا نہ چھوڑے گا۔"

ان کے چہرے کے ہاؤ بھاؤ یہ کہتے کہتے بہت ہی سخت ہو گئے" اگر طوفان نے تمہیں نگل لیا ہوتا تو تمہارے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہوتا جس کے تم لائق بھی نہیں ہو۔"

میں نے مانتے ہوئے کہا" جی جناب! میں اسی لئے طوفان سے چھپ گیا کہ کہیں ایسا اعزاز نہ پا جاؤں، جس کے کہ میں لائق ہی نہیں ہوں۔"

اس کوشش میں کہ اپنے چہرے کی مسکان مجھ سے چھپا سکیں، انھوں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ تب وہ انگیٹھی کے قریب رکھی ہوئی ایک لکڑی کی بینچ کی طرف بڑھے اور مجھ سے کہا کہ میں آرام کروں اور اپنے کپڑوں کو سوکھا لوں۔ اپنی خوشی کو میں بہت مشکل سے چھپا سکا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی نشست لی۔ وہ بھی میرے سامنے ہی ایک بینچ پر، جو پتھر کو کاٹ کر بنائی گئی تھی، بیٹھ گئے۔ وہ اپنی انگلیوں کو ایک مٹی کے برتن میں، جس میں ایک طرح کا تیل رکھا ہوا تھا، بار بار ڈبونے لگے اور اس پرندہ کے سر اور پروں کو لگانے لگے۔ بنا اوپر کو دیکھے ہی بولے" طاقتور ہوا نے اس پرندہ کو زندگی اور موت کے درمیان پتھروں پر دے مارا تھا۔"

مقابلہ سا کرتے ہوئے میں نے جواب دیا" اور خوف ناک طوفان نے اس سے پہلے کہ میرا سر چکنا چور ہو جائے اور میرے پاؤں ٹوٹ جائیں مجھے بھٹکا کر آپ کے دروازے پر بھیج دیا۔"

سنجیدگی سے انھوں نے میری طرف دیکھا اور بولے،" میری تو بھی چاہت ہے کہ انسان پرندوں کا سا مزاج اپنائے اور طوفان انسان کے پاؤں توڑ ڈالے۔ انسان کا جھکاؤ خوف اور بزدلی کی طرف ہے اور جیسے ہی وہ محسوس کرتا ہے کہ طوفان جاگ گیا ہے، وہ رینگتے رینگتے گپھاؤں اور کھائیوں میں گھس جاتا ہے۔ اپنے کو چھپا لیتا ہے۔

میرا مقصد تھا کہ ان کے خود ساخت قبول کردہ تنہا رہائش کی کہانی جان لوں۔ اس لئے میں انھیں یہ کہہ کر جوش دلایا؛" ہاں پرندوں کے پاس ایسا اعزاز اور بہادری ہے، جو انسانوں کے پاس نہیں۔ انسان مجلسی اور معاشرتی روایتوں کے سائے میں رہتا ہے۔ جو اس نے اپنے لئے خود بنائے ہیں۔ لیکن پرندے اسی آزادی اور سدا سے چلے آ رہے نظام کے تحت رہتے ہیں، جن کی وجہ سے زمین سورج کے چاروں سمت بنے راستے پر لگاتار گھومتی رہتی ہے۔"

ان کی آنکھیں اور چہرہ چمکنے لگے، مانو مجھ میں انھوں نے ایک سمجھدار شاگرد کو پا لیا ہو۔ وہ بولے،" بہت خوب! اگر تمہیں خود اپنے الفاظ پر بھروسہ ہے تو تمہیں تہذیب اور اس کی آلودہ روایت اور بہت پرانی روایتوں کو ابھی کے ابھی چھوڑ دینا چاہئے اور پرندوں کی طرح ایسی سونی جگہوں پر رہنا چاہئے جہاں آسمان اور زمین کے اعلیٰ نظام کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو۔

" بھروسہ رکھنا ایک اچھی بات ہے؛ لیکن اس بھروسہ کو استعمال میں لانا بہادری کا کام ہے۔ کتنے انسان ایسے ہیں، جو سمندر کے شور کی طرح چیختے رہتے ہیں، لیکن ان کی زندگی کھوکھلی اور جام ہوتی ہے۔ جیسے کہ سڑتی ہوئی دلدل، اور کتنے ایسے ہیں، جو اپنے سروں کو پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر اٹھائے چلتے ہیں، لیکن ان کی روح گھنے اندھیروں میں پڑی سوتی رہتی ہے۔

وہ کانپتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور پرندے کو کھڑکی کے اوپر ایک تہ کئے ہوئے کپڑے پر رکھ آئے۔ تب انھوں نے کچھ سوکھی لکڑیاں انگیٹھی میں ڈال دیں۔ اور بولے، ’’اپنے جوتوں کو اتار دو اور اپنے پیروں کو سینک لو، کیوں کہ بھیگے رہنا آدمی کی تندرستی کے لئے نقصاندہ ہے۔ تم اپنے کپڑوں کو ٹھیک سے سوکھا لو اور آرام سے بیٹھو۔‘‘

یوسف صاحب کے اس مزاج اور میزبانی نے میری امیدوں کو جگا دیا۔ میں آگے مزید قریب کھسک گیا اور میرے بھیگے کرتے سے پانی بھاپ بن کر اڑنے لگا۔ جب وہ بھورے آسمان کو نہارتے ہوئے ڈیوڑھی پر کھڑے رہے میرا ذہن ان کے رازوں کی تلاش میں دوڑ رہا تھا۔ میں نے ایک انجان کی طرح ان سے پوچھا، ’’کیا آپ بہت دنوں سے یہاں رہ رہے ہیں؟‘‘

میری طرف دیکھے بنا ہی انھوں نے دھیمی آواز میں کہا، ’’میں اس جگہ پر تب آیا تھا، جب یہ زمین لطیف اور بے دھڑ تھی۔ جب اس کے رازوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر تیرتی تھی۔‘‘

یہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ غصہ اور بے ترتیب علم کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے دل ہی دل میں میں بولا، ’’کتنے عجیب انسان ہیں یہ اور کتنا مشکل ہے یہ ان کی اصلیت کو پہنچ پانا! لیکن مجھے احتیاط کے ساتھ دھیرے دھیرے اور صبر رکھ کر تب تک چوٹ کرنی ہوگی، جب تک ان کی خاموشی بات چیت میں نہ تبدیل ہو جائے اور ان کی انفرادیت سمجھ میں نہ آ جائے!‘‘

رات اپنی اندھیری چادر ان گھاٹیوں پر پھیلا رہی تھی۔ متوالا طوفان چیخ رہا تھا اور بارش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ بائبل والی باڑھ چھتیہ کو ختم کرنے اور خدا کی زمین پر سے انسانوں کی گندگی کو دھونے کے لئے پھر سے آ رہی ہے۔

ایسا محسوس ہونے لگا کہ ذروں کے انقلاب نے یوسف صاحب کے دل میں ایک ایسا سکون پیدا کیا ہے، جو عموماً مزاج پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے اور اکیلے پن کو خوشیوں کا عکاس کر جاتی ہے۔ انھوں نے دو موم بتیاں سلگائیں اور تب میرے سامنے شراب کی ایک صراحی اور ایک بڑی طشتری میں روٹی مکھن، زیتون کے پھل، شہد اور کچھ سوکھے میوے لا کر رکھے۔ تب وہ میرے پاس بیٹھ گئے اور کھانے کی تھوڑی مقدار کے لئے، اس کی سادگی کے لئے نہیں، معافی مانگ کر، انھوں نے مجھ کو کھانے کا حکم دیا۔

ہم اس سمجھی بوجھی خاموشی میں ہوا کے نوحہ اور بارش کے شور کو سنتے ہوئے ساتھ ساتھ کھانا کھانے لگے ساتھ ہی میں ان کے چہرے کو گھورتا رہا اور ان کے دل کے رازوں کو کرید کرید کر نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ان کی غیر معمولی شخصیت کی ممکن وجوہات کو بھی سوچتا رہا۔ کھانا ختم کر کے انھوں نے انگیٹھی پر سے ایک پیتل کی کیتلی اٹھائی اور اس میں سے اصلی خوشبودار کافی دو پیالوں میں انڈیل دی۔ پھر انھوں نے ایک چھوٹے سے لکڑی کے بکس کو کھولا اور ’بھائی‘ لفظ سے مخاطب کر، اس میں سے ایک سگریٹ تحفتاً دی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے سگریٹ لے لی، لیکن جو کچھ بھی میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اس پر مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ انھوں نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور اپنی سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر اور کافی کی ایک چسکی لے کر انھوں نے کہا، ’’ضرور ہی تم شراب، کافی اور سگریٹ یہاں پا کر سوچ میں پڑ گئے ہو اور میرے کھان پان عیش و آرام پر انھیں لوگوں میں سے ایک ہو، جو ان باتوں میں بھروسہ رکھتے ہیں، کہ لوگوں سے دور رہنے پر انسان زندگی سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ اور ایسے انسان کو اس زندگی سے بھی دور رہنا چاہئے۔‘‘

❑❑❑

Izza Moin
D/o. Abdul Moin
Hindupura Samman Shaheed
Sambhal-244302 (U.P)

فرہنگ آصفیہ سے

آفتابی۔ ف۔ اسم مؤنث (۱) سورج مکھی۔ ڈھال۔ ایک دائرہ سا بنا ہوا ہوتا ہے جو بادشاہوں کے جلوس میں ماہی مراتب کے ساتھ چلتا ہے اور بادشاہوں کے سر پر اس کا سایہ بھی مثل چھتر پڑتا ہے۔ اور کبھی پان کی شکل پر مثلثی بھی بنائی جاتی ہے۔ (۲) آفتاب پرست۔ شماس۔ شماسی (۳) ایک قسم کی آتشبازی ہوتی ہے جس میں شورہ۔ گندھک۔ انار دانی نمک وغیرہ بھر کر قلمیں سی بنا لیتے ہیں (۴) وہ چھتری جو صرف دھوپ سے بچائے بارش سے پناہ نہ دے (صفت) گول۔ مدور۔ گول مول۔ دائرہ۔ چکر۔ جیسے آفتابی چہرہ آفتابی دائرہ۔

اسم اعظم۔ ف۔ ع۔ اسم مذکر۔ خدا ئے تعالیٰ کے تمام ناموں سے بڑا نام۔ خدا تعالیٰ۔ ذاتی نام۔ اللہ۔ حی القیوم۔ (اس نام کی تعیین میں بہت سا اختلاف ہے بعض کے نزدیک اللہ بعض کے نزدیک صمد۔ بعض کے نزدیک حی القیوم اور بعض کے نزدیک الرحمان الرحیم ہے۔ قاضی حمید الدین ناگوری نے لفظ ہو کو اسم اعظم قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسم ہو تمام اسمائے الٰہی کی اصل اور آل ہے جس طرح سورہ فاتحہ قرآن مجید کی اصل اور مآل ہے عبد الرزاق کاشی نے اسم اعظم کے معنی میں یہ رباعی لکھ کر اپنی رائے کا فیصلہ کر لیا ہے

ملکہ نسیم

غزل

شاخِ گل، رنگینیاں ، پُر وائیاں، بھیگا سماں
لکھ رہا ہے کون موسم کی انوکھی داستاں

خواہشوں کی برف پیروں پر مرے جمتی رہی
میں کھڑی تھی بند آنکھوں میں لیے بکھرا سماں

پاؤں میں جھوٹی انا کی بیڑیاں پہنے رہی
سامنے نظروں کے میرے جل گیا میرا مکاں

کلفتوں کی دھول جب پونچھی تو آئینے میں تھا
اترا اترا ایک چہرہ آنسوؤں کے درمیاں

کچھ شکستہ خواب لے کر شبنمی پلکوں کے ساتھ
حال کی دہلیز پر بیٹھی ہے یادِ رفتگاں

ایک اک پل زندگی کا جس کو دے ڈالا نسیم
ہو گیا ہے کیوں نہ جانے اس قدر وہ بدگماں

نسیم نکہت

غزل

تیری محبتوں کے حوالوں میں قید ہوں
میں اک غزل ہوں اور سالوں میں قید ہوں

گھر سے چلی تھی میں تو نگاہیں تھیں مطمئن
آئی ہوں لوٹ کر تو سوالوں میں قید ہوں

اک اتفاق تھا وہ ملا اور بچھڑ گیا
لیکن میں اب بھی اس کے خیالوں میں قید ہوں

کیا جانے کیا ہوئی مری ننھی سی اوڑھنی
گھٹتا ہے دم میں ریشمی شالوں میں قید ہوں

پتھر تھی میں تو تازہ ہوائیں بھی تھیں نصیب
مورت جو بن گئی تو شوالوں میں قید ہوں

نکہت کوئی خزانہ نہیں زندگی مری
ناگوں کا مجھ پہ پہرہ ہے تالوں میں قید ہوں

غزلیں

آصفہ زمانی

گھر کو کیسا بھی تم سجا رکھنا
کہیں غم کا بھی داخلہ رکھنا

گر کسی کو سمجھنا اپنا تم
دھوکہ کھانے کا حوصلہ رکھنا

اتنی قربت کسی سے مت رکھو
کچھ ضروری ہے فاصلہ رکھنا

ان کی ہر بات میٹھی ہوتی ہے
جھوٹی باتوں کا مت گلہ رکھنا

زندگی ایک بار ملتی ہے
اس کو جینے کا حوصلہ رکھنا

ناامیدی کو کفر کہتے ہیں
رب سے امید آصفہؔ رکھنا

زندگی میں تجھ کو پانا آج تک بھولا نہیں
پھر ترا چپکے سے جانا آج تک بھولا نہیں

پڑ کے پیروں پر پرستش کی اجازت چاہنا
اور مرا وہ بوکھلانا آج تک بھولا نہیں

ہر بشر ہے خود غرض مہر و وفا کچھ بھی نہیں
ہم کو تنہا چھوڑ جانا آج تک بھولا نہیں

تم ہمارے تھے ہی کب اس کا ہوا احساس جب
دل کا سکتے میں وہ آنا آج تک بھولا نہیں

آصفہؔ تو کتنی بھولی ہے ستم سہتی رہی
پھر بھی تیرا مسکرانا آج تک بھولا نہیں

اسناتھ کنول

غزل

کاغذ قلم دوات کے اندر رک جاتا ہے
جو لمحہ اس ذات کے اندر رک جاتا ہے

سورج دن بھر زہر اگلتا رہتا ہے
چاند کا زعم بھی رات کے اندر رک جاتا ہے

پہلے سانس جما دیتا ہے ہونٹوں پر
پھر وہ اپنی گھات کے اندر رک جاتا ہے

نکل نہیں سکتا دھرتی کا بنجر پن
جو قطرہ برسات کے اندر رک جاتا ہے

حرف کا دیپ ہوا سے کیسے الجھے گا
یہ نقطہ ہر بات کے اندر رک جاتا ہے

ہجر کا موسم خاموشی اور رات کا ڈر
یادوں کی بارات کے اندر رک جاتا ہے

آصفہ نشاط

غزل

اپنا گھر بازار میں کیوں رکھ دیا
واقعہ اخبار میں کیوں رکھ دیا

خواب کی اپنی بھی اک توقیر ہے
دیدۂ بے دار میں کیوں رکھ دیا

کھیل میں خانہ بدلنے کے لئے
اپنا مہرہ ہار میں کیوں رکھ دیا

سر بچانے تک تو شاید ٹھیک ہو
خوف یہ دستار میں کیوں رکھ دیا

نیند نہ آنا یہ راتوں کو نشاطؔ
دل کو اس آزار میں کیوں رکھ دیا

ایتا پرسورام میتا

غزل

بن گئے دل کے فسانے کیا کیا
کھل گئے راز نہ جانے کیا کیا

کون تھا میرے علاوہ اس کا
اس نے ڈھونڈے تھے ٹھکانے کیا کیا

رحمت عشق نے بخشے مجھ کو
اس کی یادوں کے خزانے کیا کیا

آج رہ رہ کے مجھے یاد آئے
اس کے انداز پرانے کیا کیا

رقص کرتی ہوئی یادیں ان کی
اور دل گائے ترانے کیا کیا

تیرا انداز نرالا سب سے
تیر تو ایک نشانے کیا کیا

آرزو میری وہی ہے لیکن
اس کو آتے ہیں بہانے کیا کیا

راز دل لاکھ چھپایا لیکن
کہہ دیا اس کی ادا نے کیا کیا

دل نے تو دل ہی کی مانی میتا
عقل دیتی رہی طعنے کیا کیا

بلقیس خان

غزل

تمہاری یاد کا اک دائرہ بناتی ہوں
پھر اس میں رہنے کی کوئی جگہ بناتی ہوں

وہ اپنے گرد اٹھاتا ہے روز دیواریں
میں اس کی سمت نیا راستہ بناتی ہوں

زمانہ بڑھ کے وہی پیڑ کاٹ دیتا ہے
میں جس کی شاخ پہ اک گھونسلہ بناتی ہوں

وہ گھول جاتا ہے نفرت کی تلخیاں آ کر
میں چاہتوں کا نیا ذائقہ بناتی ہوں

خیال و حرف تغزل میں ڈھال کر بلقیسؔ
میں اپنے درد سبھی غزلیہ بناتی ہوں

لذیذ پکوان

کشمیری چائے

اجزا: پتی 2 کھانے کے چمچے، پانی 2 کپ، دودھ 2 کپ، چینی حسب ذائقہ، نمک آدھ چائے کا چمچہ، بادام، پستہ

ترکیب: ایک کپ پانی میں پتی شامل کر کے 20 منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ایک کپ مزید پانی شامل کر کے پھینٹتے جائیں۔ دودھ شامل کر کے 20 منٹ ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ اگر رنگ نہ آئے تو سرخ فوڈ کلر شامل کریں۔ پستہ، بادام شامل کر کے پیش کریں۔

کافی آئس کریم

اشیا: دودھ دو سیر، کریم یا مکھن چار اونس، شکر 150 گرام، کافی کے دانے ایک چمچہ، کسٹرڈ اور کافی پاؤڈر چار چائے کے چمچے

ترکیب: دودھ کو برتن میں پکنے کے لیے چولہے پر رکھ دیں تب تک گرم کرتے رہیں جبکہ دودھ ڈیڑھ سیر نہ ہوجائے۔ اب اس دودھ میں شکر اور کسٹرڈ پاؤڈر ملالیں۔ برتن میں کافی پاؤڈر اور کریم کو آپس میں اچھا مکسڈ کرلیں۔ جب جھاگ آجائے تو اس میں ایک کپ دودھ ملالیں۔ اس آمیزہ کو کسٹرڈ والے دودھ میں ملائیں۔ ان تمام کو خوب ملاتے رہیں

کٹورے میں ڈال کر فریج میں رکھ دیں جب ٹھنڈا ہو کر منجمد ہو جائے تو ان پر کافی کے دانے ڈال کر پیش کریں۔

چکن کوکٹیل پلاؤ سے لطف اندوز ہوں

اجزا: چاول۔ ایک کلو، مرغی (بون لیس)۔ ایک کلو، ہری پیاز (ہرا حصہ باریک کٹا ہوا)۔ چار عدد، گاجر (باریک اور چھوٹے کیوبز)۔ چار عدد، شملہ مرچیں (باریک اور چھوٹے کیوبز) چار سے چھ عدد، ادرک لہسن (پیسٹ)۔ دو کھانے کے چمچ، سیاہ مرچ پاؤڈر۔ ایک چائے کا چمچ، لونگ (باریک پسی ہوئی) پانچ عدد، اجوائن (پسی ہوئی) ایک چائے کا چمچ، دار چینی (باریک پسی ہوئی)، ایک انچ کا ٹکڑا، سونف (باریک پسی ہوئی)، ایک چائے کا چمچ، چائنیز نمک دو کھانے کے چمچ، سرکہ دو چائے کے چمچ، سویا سوس دو کھانے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ، زعفران چٹکی بھر، گھی حسب ضرورت، ہری مرچیں (بڑی) دس عدد

ترکیب: گوشت میں ادرک، لہسن کا پیسٹ، تھوڑا سرکہ، سویا سوس، زعفران اور نمک ڈال کر میرینیٹ کر کے رکھ دیں۔ اس کے بعد اسے دھیمی آنچ پر فرائی کر کے گولڈن کر کے نکال لیں۔ ایک پتیلی لیں اس

میں گھی گرم کرکے اس میں ہری پیاز ڈال کر فرائی کرلیں۔اس میں گاجر اور شملہ مرچیں شامل کرلیں اور اچھی طرح چمچہ چلائیں۔اس میں سیاہ مرچ پاؤڈر، لونگ، دار چینی، سونف، اجوائن، نمک اور چائنیز نمک ڈالیں۔ایک چائے کا چمچ سرکہ اور ایک چائے کا چمچ سویا سوس ڈال کر فرائی کیا ہوا گوشت اور بھگوئے ہوئے چاول ڈالیں اور اس میں اتنا پانی شامل کریں کہ چاول کھڑے کھڑے رہیں، ابال آنے کے بعد دم پر رکھ دیں۔آخر میں بڑی ہری مرچیں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور سرو کریں۔

ربڑی

اجزا: دودھ تین کلو، الائچی پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، کیوڑہ دو کھانے کے چمچ، چینی دو کپ، بادام، پستہ حسب ضرورت

ترکیب: ربڑی ایک خاص کڑاہی میں بنائی جاتی ہے جس کا پیندہ سیدھا ہوتا ہے اسی قسم کی کڑاہی میں جلیبیاں بھی بناتے ہیں۔اسے عام طور پر تئی کہا جاتا ہے۔

ایک کلو دودھ کو تئی میں اس طرح پکائیں کہ دودھ کے بلبلے نہ بنے بس ہلکا ہلکا پکے، دودھ پکنے سے اوپر جو تہہ آئے اسے فلیٹ چمچ سے کڑاہی میں ایک طرف کرتے جائیں۔

دودھ کے اوپر بننے والی تہہ جب کڑاہی میں ایک طرف کردیں تو تھوڑا سا مزید دودھ کڑاہی میں ڈالیں۔

جب سارا دودھ کڑاہی میں ڈال دیں اور سائڈ پر کافی گاڑھی تہہ بن جائے تو دودھ میں کیوڑہ، الائچی پاؤڈر اور چینی شامل کرکے دودھ کو پکائیں۔چینی دودھ میں حل ہوجائے تو دودھ کو جو سائڈ پر بالائی کی تہیں کی تھیں ان کے اوپر ڈالتے ہوئے مکس کریں، یہ سارا آمیزہ گاڑھا ہوکے ربڑی بن جائے گا۔

اس ربڑی کو پلیٹ میں نکالیں اور ٹھنڈا کرکے بادام، پستہ سے گارنش کرکے سرو کریں۔

یہ ربڑی نرم ہوگی۔اگر خشک ربڑی بنانا چاہتے ہیں تو ربڑی کو مزید پکا کے دودھ اور چینی کو خشک کریں۔اس ربڑی کے اوپر تھوڑی سی چینی ڈال کے اس کو پلیٹ میں نکال لیں۔

چمچ کو ہلکے ہاتھوں سے مسلسل ہلانا ہے لیکن پیندے کے ساتھ رگڑنا نہیں۔آخر میں ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

انڈے کا حلوہ

اجزا: انڈے چھ عدد، کھویا آدھا کلو، (چھوٹی الائچی چھ عدد (پسی ہوئی، چینی دو پیالی، زردے کا رنگ تھوڑا سا، گھی یا تیل ڈیڑھ پیالی، بادام اور پستے حسبِ ضرورت (باریک کٹے ہوئے، چاندی کے ورق گارنش کے لیے

ترکیب: ایک بڑے پیالے میں انڈے پھینٹ لیں۔اب ان انڈوں میں کھویا، دو پیالی چینی، زردے کا رنگ اور پسی ہوئی الائچی ڈال کر بلینڈر میں بلینڈ کریں۔پھر اس میں تیل ڈال کر مکس کریں۔اب اسے دیگچی میں ڈال کر خوب اچھی طرح بھون لیں۔

جب چھوٹے چھوٹے دانے بننے لگیں اور تیل الگ ہونے لگے تو ٹرے میں ذرا سی چکنائی لگا کر تیار حلوے کو پھیلا دیں۔پھر اس میں حسب ضرورت باریک کٹے بادام اور پستے ڈال دیں۔آخر میں چاندی کے ورق سے گارنش کرکے سرو کریں۔

سید محمد حسان نگرامی

آپ کے کمر میں درد کی وجہ ورم رحم تو نہیں؟

آج کل کمر کا درد بہت عام ہوگیا ہے اکثر خواتین درد کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتی ہیں، تھوڑی دیر کھڑے رہنے میں دشواری ہوتی ہے اگر موٹاپا بھی ہوتو یہ صورت حال اور خراب ہوجاتی ہے اس تکلیف کے لئے خواتین پہلے لیڈی ڈاکٹرس کو دکھانے کے بجائے آرتھوپیڈک سرجن سے مشورہ لیتی ہیں اور پھر مہینوں بلکہ سالوں تک بروفین، ڈائکلوفینیک سوڈیم جیسی دوائیں استعمال کرتی ہیں ظاہر ہے درد کم کرنے والی دواؤں سے آرام ملتا ہی ہے کچھ ڈاکٹر کیلشیم کھلا دیتے ہیں اس سے بھی پیروں کی اینٹھن اور جوڑوں کی تکلیف میں فرق پڑتا ہے جب حالات مزید خراب ہوجاتے ہیں اور عورتوں میں لیکوریا، پیشاب میں جلن، جنسی فعل میں بڑھتی تکلیف زندگی کا معمول بن جاتی ہے پھر جاکے کہیں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چلو کسی لیڈی ڈاکٹر یا بڑے حکیم سے مشورہ لیں کہیں یہ پیڑو کے ورم کی وجہ سے کمر کا درد تو نہیں ہے جب مرض بڑھ جاتا ہے پھر یہ تشخیص ہوجاتی ہے کہ درد کی اصل وجہ ورم رحم یا بچہ دانی کا ورم ہے اسی کیفیت سے بچنے کے لئے بچہ دانی کا ورم جسے انگریزی میں انڈو میٹرائٹس(Endometritis) کہتے ہیں سے متعلق بنیادی باتیں پیش کی جارہی ہیں۔

جدید طب کے مطابق اس کی دوقسمیں ہوتی ہیں

1۔اکوٹ انڈومیٹرائٹس(Acute Endometritis)

2۔کرانک انڈومیٹرائٹس (Chronic Endometritis)

اکوٹ انڈومیٹرائٹس میں بچہ دانی کے اندرونی جھلی کے غدود Glands میں چھوٹی چھوٹی پھنسیاں (Micro abscesses) ہوتی ہیں جبکہ کرانک (پرانی) صورت میں بچہ دانی کی جھلی میں پلاز ما سلس (خلیات) پائے جاتے ہیں۔ دونوں کا سبب انفکشن ہے اس کے علاوہ آپریشن کے ذریعہ بچہ پیدا ہونے یا بار بار اسقاط (ابارشن) ہونے، زیادہ موٹاپے کی وجہ سے اور بچہ دانی کے اندر خراب مادے کے جمع ہونے سے پھر یہ بیماری ہوسکتی ہے۔

اگر علامت کی بات کریں تو کمر کے نچلے حصہ میں درد، بخار، اور رحم یعنی بچہ دانی سے سفید رطوبت بھی مخصوص علامت ہوتی ہے جسے ہم طبی اصطلاح میں لیکوریا یا سیلان الرحم کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جوڑی لگ کر بخار آتا ہے، پیروں میں گرانی محسوس ہوتی ہے اور مستقل درد رہتا ہے کبھی یہ درد پیٹھ، کمر اور سر تک پہنچ جاتا ہے رانوں میں کھنچاؤ کے ساتھ درد ہوتا ہے۔ پیشاب کی جگہ جلن محسوس ہوتی ہے، بار بار پیشاب لگتا ہے

پیاس کی شدت ہوتی ہے، منہ کا مزہ تلخ ہوتا ہے سانس تیز چلتی ہے، رحم سے جو پانی یا رطوبت نکلتی ہے اس میں بدبو بہت ہوتی ہے کبھی قے آتی ہے مرض بڑھنے میں مریضہ بے ہوش بھی ہوسکتی ہے علاج نہ ہونے کی صورت میں یہ مرض کینسر تک پہنچ جاتا ہے۔اور خاص بات یہ ہے کہ اتنی پیچیدہ صورت حال ہونے کے بعد ہم درد کی دوا اور درد کم کرنے والے تیل لگاتے رہتے ہیں۔

مسئلہ کا حل کیا ہے۔

ایسے حالات میں ہمیں سب سے پہلے لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہئے کبھی کبھی گٹھیا اور ورم رحم دونوں ایک ساتھ ہوتے ہیں اس کے لئے ہمیں گٹھیا کے ڈاکٹر سے مشورہ لینا ہوتا ہے۔لیڈی ڈاکٹر سے ملنے کے بعد ماہواری کی عادت ان کے کم از کم اور زیادہ دن کا شمار رکھنا ہوگا کیا لیکوریا تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی ماہواری کے خون میں بے حد بدبو ہوتی ہے یہ بھی کسی خطرناک مرض کی علامت ہوسکتی ہے۔ اسی طرح (سیکس) مرد اور عورتوں کے جنسی تعلقات میں زیادہ درد ہونے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ان علامات کے علاوہ انٹرا ویجائنل سونوگرافی (Intravaginal Sonography) کرنے سے بھی سبب کا تعین ہوسکتا ہے۔قدیم اطباء یونان نے کمر درد کے ساتھ چندیا کے درد ہونے کو بھی ایک تشخیصی علامت قرار دیا ہے۔الٹراساؤنڈ کے علاوہ پیشاب میں جراثیم کی موجودگی (Urine culture) کم از کم 2 ماہ بعد ضرور کرانا چاہئے۔خون کی جانچ اور جسم میں ہیموگلوبن کی مقدار کم ہو تو فوراً علاج کرائیں، خون کی جانچ میں عرصہ تک رہنے والے انفکشن کی نشاندہی ہو سکتی ہے ساتھ میں بخار، بدن درد، بھوک کی کمی بھی کمر کے درد کے ساتھ ورم رحم کی علامت ہوگی۔

احتیاط وعلاج:

سب سے بڑی احتیاط یہ ہے کہ ماہواری کے دوران صفائی پر خصوصی توجہ دیں اور صرف صاف ستھرے پیڈ استعمال کریں۔آبدست بھی صاف پانی سے لیں عورتوں میں یاد رہے زیادہ تر انفکشن باتھ روم سے منتقل ہوتا ہے لہذا باتھ روم کی صفائی کا مکمل خیال رکھنا چاہئے۔

ایک دیسی طریقہ حکیموں نے بہت مفید بتایا ہے کہ آبدست کے پانی میں نیم کی پتیوں کا جوشاندہ ملا کر استعمال کریں۔

جہاں تک علاج کا تعلق ہے اگر پیڑوں میں ورم ہو، جھکنے پر پیڑوں میں درد ہو تو محلل دوائیں جیسے مکو، کاسنی، برنجاسف، گل نیم ہموزن لیکر ان کا جوشاندہ پلائیں۔

۔ مرکب دواؤں میں معجون دبید الورد، معجون موچرس، معجون آرد خرما، معجون فلاسفہ ان میں سے کوئی ایک آدھا چمچ صبح شام کھلائیں۔

۔کھیرے ککڑی، خربوزہ تربوز کا زیادہ استعمال کریں۔

صورت حال مزید خراب ہونے سے پہلے سند یافتہ لیڈی ڈاکٹر یا حکیم سے مشورہ میں تاخیر نہ کریں۔

Dr. S. M. Hassan

Dr. Hassan Herbal Clinic

Behind Medah Ganj Police Chowki

Sitapur Road, Lucknow-226020 (U.P)

جلد کی خوبصورتی بڑھائیں

بناؤ سنگھار کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے۔ چہرے کو روشن اور تابندہ رکھنے کے لیے آئے دن جدید سے جدید تر اشیاء اور آلات منڈیوں میں آرہے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک بات طے ہے کہ ہزاروں سال پرانے قدرتی اور روایتی طریقے آج بھی اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں اور ان کی افادیت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔ ایسی لاتعداد قدرتی جڑی بوٹیاں' تیل اور نباتات موجود ہیں جن کا صحت و خوبصورتی سے گہرا تعلق ہے اور آج بھی لاکھوں خواتین ان سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ جدید سائنس بھی تسلیم کرتی ہے کہ مختلف قسم کی نباتات' بیجوں اور جڑی بوٹیوں کا استعمال نہ صرف کئی امراض میں فائدہ مند ہے بلکہ ان سے نکالے ہوئے تیل جلد کی خوبصورتی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جیسے صندل' مہندی' برہمی بوٹی' سیکا کائی آملہ' ریٹھا' ناریل اور سرسوں وغیرہ کو کئی شیمپوؤں میں کسی نہ کسی شکل میں شامل ضرور کیا جاتا ہے۔

مساج کیوں کی جاتی ہے؟

مساج یا مالش سے عضلات مضبوط ہوتے ہیں اور جلد کی عمر بڑھتی ہے۔ جلد پر موجود مضر اجزا کا صفایا ہونے کے ساتھ خون کی گردش کا نظام بھی بہتر ہوتا ہے۔ نہ صرف بال تیزی سے بڑھتے ہیں بلکہ ان کی چمک دمک میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ تناؤ اور دباؤ کم ہوتا ہے ذہنی سکون ملتا ہے اور نیند بہتر ہوتی ہے۔ آنکھوں کی تھکاوٹ دور ہوتی ہے۔ ارتکاز کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور یادداشت بہتر ہوتی ہے۔

مختلف تیل اور ان کے فائدے

تلوں کا تیل: یہ جسمانی عضلات کو مضبوط بنانے کے علاوہ جلد کو نمی فراہم کرتا ہے جس سے جلد خشک ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔ بالخصوص خشک جلد کیلئے بہترین سمجھا جاتا ہے۔

سرسوں کا تیل: یہ جسم کو گرمی بخشتا اور جلد کی صفائی کرتا ہے چونکہ یہ جسمانی حرارت میں اضافہ کرتا ہے اسی لیے اس کی مالش سردیوں میں کی جاتی ہے۔

زیتون کا تیل: عموماً حساس اور نازک جلد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تل کے تیل کا بہترین نعم البدل ہے۔

بادام کا تیل: بال بڑھانے اور صحت مند رکھنے میں معاون ہے۔

ناریل کا تیل: سوکھی' روکھی اور پھیکی جلد کو نرم و ملائم اور چمکدار بناتا ہے۔ اسے بہترین موئسچرائزر کی حیثیت حاصل ہے۔ بالوں کیلئے بھی بہت مفید ہے۔ اس سے بال جلد بڑھتے اور صحت مند رہتے ہیں۔ جسم کو متوازن رکھتا ہے۔ اس کی مساج موسم بہار یعنی مارچ اپریل میں کی جاتی ہے۔

خوشبو سے علاج: اس علاج میں مختلف پتوں' پھولوں اور جڑی بوٹیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ مریض کو نہ صرف سنگھائے جاتے ہیں بلکہ ان کی مالش بھی کی جاتی ہے۔ یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ مختلف قسم کے تیلوں کی مالش سے درد دور ہونے کے علاوہ ان کی خوشبو سے بھی کئی فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

جلد کی صفائی: تیل، ہلدی اور بیسن وغیرہ ملا کر ابٹن تیار کیا جاتا ہے جسے بالخصوص شادی بیاہ کے موقع پر لڑکیاں چہرے، گردن، ہاتھوں اور بازوؤں وغیرہ پر کریم کی طرح لگاتی ہیں۔ یوں جلد نرم اور صاف و شفاف ہوجاتی ہے۔ اسی طرح بعض گھرانوں میں شادی کے موقع پر لڑکیاں

یاسمین کا تیل، روغن بادام، مونگ پھلی کا تیل، لیموں کے چھلکے اور چٹکی بھر صندل کا سفوف وغیرہ ملا کر آمیزہ بناتی ہیں جسے پورے جسم پر لگانے سے جلد روشن اور صاف ہوجاتی ہے۔

جلد کو صفائی کی ضرورت کیوں؟: قدرتی طور پر دو ہفتے بعد جلد میں تبدیلی آتی ہے یعنی اس کے پرانے خلیے مرجاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے لیتے ہیں۔ اسی لیے جلد کو ہر دو ہفتے بعد صفائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مردہ خلیوں کو جسم سے دور کیا جاسکے۔ چکنی جلد کی تو ہفتے میں ایک یا دوبار صفائی کرنا کافی ہے۔ فی الوقت ایسی کئی کریمیں، ماسک اور موئسچرائزر موجود ہیں جو قدرتی اشیاء سے بنائے گئے ہیں اور ان کا جلد کی صفائی میں اہم کردار ہے جیسے خوبانی وغیرہ کے ماسک بہت معروف ہیں۔

حسن اور صحت: نہار منہ پانی پیجئے اپنا رنگ نکھارنے کیلئے صبح نہار منہ دو تین گلاس پانی پینا معمول بنالیجئے۔ شروع میں ایک آدھ گلاس پیجئے آہستہ آہستہ آپ کی عادت بن جائیگی۔ اس سے قبض نہیں ہوگی۔ خون پتلا اور صاف ہوگا دوران خون ٹھیک رہے گا۔ آنکھوں کی چمک بڑھے گی اور چہرے کی تازگی اور دلکشی میں اضافہ ہوگا۔

صبح کی سیر: اگر ممکن ہو تو صبح کی سیر ضرور کریں۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کا خاتمہ: رات کو پانچ عدد بادام چبا کر اس طرح کھائیں کہ لعاب دہن بھی ساتھ مل جائے۔ اس کے بعد ایک کپ دودھ بالائی اتار کر پی لیں۔ یوں رنگت نکھرے گی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دور نہ ہوئے تو کافی حد تک کم ضرور ہوجائینگے۔

دوپہر کا کھانا: دس بجے ایک سیب کھائیں یا موسم کے اعتبار سے تازہ پھلوں کا رس ایک گلاس پیجئے۔ دوپہر کے کھانے میں ایک چپاتی اور حسب پسند سالن کے ساتھ ایک کھیرا، ایک ٹماٹر اور تھوڑی سی بند گوبھی کی سلاد کھائیں۔ اگر آپ شام کو چائے پینا چاہیں تو اس کے ساتھ دو عدد بسکٹ کھائیں۔

رات کا کھانا:

ساڑھے آٹھ یا نو بجے رات کا کھانا کھالیں لیکن پیٹ بھر کر نہیں بلکہ تھوڑی سی بھوک رکھ کر کھائیں اور سونے سے پہلے ایک کپ دودھ (بالائی اتار کر) پی لیں۔ کلی کر کے کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

رنگت نکھارنے کے طریقے: صبح سویرے کچے دودھ کی آدھی پیالی میں بیسن یا ابٹن ڈال کر گاڑھا پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لیپ کریں۔ دو منٹ بعد انگلیوں کی پوروں سے نیچے سے اوپر کی جانب آہستہ آہستہ ملیں۔ ابٹن نیچے گرتا جائے یہاں تک کہ چہرہ صاف ہوجائے۔ اب چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ کچے دودھ کی بساند دور کرنے کیلئے ٹالکم پاؤڈر ہتھیلیوں پر مل کر چہرے کو ہاتھوں سے آہستہ آہستہ تھپتھپائیں۔ چہرے کی جلد نرم بلکہ مخملی سفید ہوجائے گی۔

آدھے لیموں کا رس۔ ہلدی آدھی چمچی اور بیسن دو چمچی ملا کر آمیزہ بنالیں اور اس کا ماسک چہرے پر لگائیں۔ چھائیاں خاصی حد تک ختم ہوجائیں گی۔

سفید تل بھینس کے دودھ میں ڈال کر پیس لیں اور رات سوتے وقت چہرے پر ملیں۔ صبح اٹھ کر کسی اچھے صابن سے منہ دھولیں۔ چھائیاں دور ہوجائیں گی اور چہرہ دھل جائیگا۔ دن میں بھی چہرے کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ روزانہ پانچ بار منہ دھوئیں۔

کچھ بادام تھوڑے پانی میں بھگو کر رکھ دیں پھر اسی پانی میں بادام پیس لیں۔ یہ آمیزہ رات کو چہرے پر لگائیں اور صبح کسی معیاری صابن سے منہ دھولیں۔

دس تولہ شہد میں ایک لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لیپ کیجئے اور پندرہ منٹ بعد دھولیجئے۔ جھریاں ختم ہونے کے علاوہ جلد کے زیادہ کھلے مسام بند ہوجائیں گے۔

تاثرات: نگر نگر سے

زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کا اداریہ نہایت جامع اور قابل غور ہے آج کے دور میں جہاں ہر طرف بے حسی پھیلی ہوئی ہے۔ انسانی اقدار پوری طرح سے دم توڑتی جا رہی ہیں۔ خواتین کے ساتھ وحشیانہ سلوک کے واقعات آئے دن بڑھتے جا رہے ہیں ایسے ماحول میں یہ کہنا درست ہے کہ 'ہمارے معاشرے میں انسان اور انسانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور اس منظر نامے کا سب سے کربہ سچ یہ ہے کہ یہ سب دن کے اجالے اور لوگوں کے درمیان ہوتا ہے اور وہاں پر موجود لوگ خاموش تماشائی بنے ہوتے ہیں۔' انسانیت کو بچانے اور لوگوں کے درمیان محبت قائم کرنے کے لیے اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

جہانِ نسواں میں موجود سبھی مضامین بہت ہی معلوماتی اور بصیرت افروز ہیں۔ کہانیوں کا حصہ بھی بہت دلچسپ ہے اور دل کو چھونے والا ہے خاص طور سے رینو بہل کی کہانی 'کرپا'، رونق جمالی کی کہانی 'سرخاب فاطمہ' اور رخشندہ روحی کی کہانی 'محبت' بہت ہی متاثر کرتی ہیں۔

صحت کے تعلق سے 'بریسٹ کینسر' مضمون بہت ہی معلوماتی اور مفید ہے اس طرح کے مضامین شائع کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ماشاءاللہ رسالہ کی طباعت واشاعت اور اس کی ڈیزائننگ بہت ہی جاذب نظر ہے۔ خواتین دنیا کی پابندی سے اشاعت کے لیے بہت بہت مبارک باد۔

نکہت پروین، سلطان پور (یوپی)

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان 'خواتین دنیا' جولائی 2018 ہمدست ہوا۔ مکمل رسالہ کی ترتیب وپیش کش اتنی جاذب نظر اور پرکشش ہے کہ ایک ہی نشست میں مطالعہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ رنگوں کی آمیزش خوبصورت طباعت، عمدہ بائنڈنگ، جاذب نظر کاغذ نے رسالہ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ متن کے اعتبار سے جویریہ قاضی کی تحریر 'سانس کی طرح چلے منزل ہستی' کی زبان بہت رواں دواں اور خوبصورت ہے یوگا جیسے خشک مضمون کو اپنے خصوصی انداز بیان اور خوبصورت جملوں سے دلچسپ بنادیا ہے مضمون بہت ہی کارآمد اور مفید ہے۔

پنچایتوں میں خواتین کا کردار بہت ہی معلوماتی اور نوجوان خواتین کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ دیگر مضامین بھی بہت ہی بصیرت افروز ہیں۔ زیر نظر شمارے میں جو کہانیاں ہیں سبھی دلچسپ اور عصر حاضر کی نفسیات و مسائل سے مملو ہیں۔ حسن سخن میں موجود شاعری بھی عصر حاضر کی غماز ہے۔ باورچی خانہ، صحت اور آرائش وزیبائش بھی کچھ دلچسپ ہے۔

ریحانہ تبسم، روڑکی، اتراکھنڈ

ماہنامہ خواتین دنیا بھارت ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے رسائل میں اپنی جاذبیت، انفرادیت اور وقار ومعیار کی وجہ سے مقبولیت اور ہردلعزیزی کے اپنے انوکھے ریکارڈ بناتا جا رہا ہے۔ جولائی کے شمارے میں شامل مضامین بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ خواتین کی صلاحیتوں کا اعلان کرتے ناز آفرین، زرنگار، جویریہ قاضی اور تسنیم بانو کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ جویریہ قاضی کے مضمون کی زبان گو کہ بہت خوبصورت ہے لیکن سلاست کی راہ پر چلتے چلتے ادق وسنگلاخ ہو جاتی ہے۔ تاہم ان کو اس لیے مبارک باد کہ وہ اپنے مضمون میں بہت سی تراکیب، استعارے تشبیہات اور تلازمات استعمال کر جاتی ہیں جن کو اردو والے بالکل بھولتے جا رہے ہیں یا بالکل تازہ اور انوکھی ومنفرد ہیں، آرائش وزیبائش کے مستقل کالم میں گھی کوار یعنی ایلوویرا کی اہمیت وافادیت اور اس کی ضرورت پر بہت اچھا مضمون ہے۔

ادارے کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔

روشن آرا، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

'خواتین دنیا' صحافتی دنیا میں اپنی علاحدہ اور منفرد شناخت قائم کر چکا ہے یہ خواتین کے ہر طبقہ کے لیے مفید و کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ خانگی امور میں بھی گھریلو عورتوں کا بھر پور تعاون کرتا ہے۔ ہر ماہ اس میں کچھ نہ کچھ نیا ہوتا۔ خواتین کے مسائل پر لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد خواتین دنیا میں نظر آتی ہے۔ محقق و نقاد خواتین سے اسی ماہنامے میں تعارف ہوتا ہے۔ اسی رسالے میں کئی اچھی شاعرات سے شناسائی ہوئی، کئی اچھی کہانی کار خواتین کو اسی ماہنامے میں دیکھا۔ خواجہ عبدالمنتقم کی قانونی تحریریں خواتین کو اپنے حقوق کے لیے بیدار کرتی ہیں، خواتین دنیا میں سارا مواد کارآمد اور سود مند ہوتا ہے۔ ہر ماہ کے شمارے کو سنبھال کر رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ گزارش یہ ہے کہ کچھ ایسے سلسلے بھی شروع کیے جائیں جن سے آج کی لڑکیوں کو اپنا کیریر بنانے میں مدد ملے۔ شکریہ۔

آفرین ذرین، امراؤتی، مہاراشٹر

یوں تو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی نمایاں کامیابیوں کی تفصیل لکھنے کے لیے ہی ایک عدد ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن ماہنامہ 'خواتین دنیا' تو ایک ایسا سنگ میل ہے۔ جس کو دیکھ کر صحافتی دنیا کے نئے مسافر اپنی سمتِ سفر اور منزل مقصود کا تعین کرنے پر مجبور ہوں گے۔ میں نے تقریباً سبھی شمارے پڑھے ہیں اگر ان سب کے اوصاف لکھوں تو شاید کتاب بھی ناکافی ہو۔ اس بار کے شمارے کا اداریہ عصری حسیت سے مملو نظر آیا۔ خواتین اور معاشرے کے تعلق، انسانی بے حسی، سیاسی تغافلِ عارفانہ اور نسائی طبقے کی مجرمانہ خاموشی پر مکالمے کی ضرب کاری نے جوش کے ساتھ ہوش کو بیدار کیا۔ 'تحریک نسواں اور چند ناول' پر مغز مضمون ہے جس میں ناز آفرین کی تحقیقی صلاحیتوں نے اپنے جلوے دکھائے ہیں۔ حلیمہ فردوس پر اچھا مضمون شامل اشاعت کیا گیا۔ غزلیں اور کہانیاں کافی متاثر کن تھیں۔ مستقل کالم اپنے معیار کو نہ صرف برقرار رکھے ہوئے لگے بلکہ نئی بلندیوں کو چھوتے جا رہے ہیں۔ میری طرف سے کونسل کے سربراہ ذمہ داران اور ادارتی عملے کو مبارک باد۔

مدحت ثنا، کریم گنج لکھنؤ (یوپی)

'خواتین دنیا' متواتر نکھرتا اور سنورتا جا رہا ہے۔ اس کی تحریریں، تخلیقات مستقل کالم بہت اچھے اور ہر شعبۂ حیات کی ضرورت کا تکملہ کرتے ہیں۔ ماہ جون کا شمارہ نئی چمک دمک کے ساتھ میرے مطالعہ میں آیا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ شبنم عشائی، بشریٰ ہاشمی، بیگم لکھنوی اور اندرا ورما کی شعری تخلیقات نے بہت متاثر کیا۔ رینو بہل کی کہانی کرپا تو بہت کمال کا نثر پارہ تھا۔ رینو جی کے مشاہداتی افسانے عصری حسیت سے بھرپور اور انسانی بے حسی پر تازیانہ ہوتے ہیں۔ رخشندہ روحی مہدی کی محبت بھی اپنی نوعیت کی منفرد کہانی لگی۔ نکہت سخن کے تحت شاعرات کے اشعار شعری ادب کو مالا مال کرتے نظر آئے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ آپ کے حسن انتخاب کا تخلیقی ہنر صحافی معیار کو معراج کی طرف لے جاتا ہے۔ ترتیب بھی لاجواب ہے، علاوہ ازیں ایک گزارش یہ تھی کہ رسالے کی پروف ریڈنگ پر خصوصی توجہ فرماتے رہیں دوسرے خواتین کے لیے کچھ نئے سلسلے بھی شروع کریں ایسے سلسلے جو طالبات اور کام کاجی خواتین کے لیے مشعل راہ بن سکیں۔

شہناز فاطمہ، رحمت نگر، بھوپال (ایم پی)

مکالمہ میں آپ نے نہ صرف ہمارے دل کی بلکہ ہر حساس ہندوستانی کے دل کی بات کا احاطہ کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے حسی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے لوگوں میں قوت برداشت اور نظر انداز کرنے کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے ہر شخص من مانے طریقہ سے جینا چاہتا ہے جس کی وجہ سے ہر جگہ انتشار اور حادثات کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا آپ نے بروقت توجہ دلائی اس مسئلہ پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، جس کے لیے آپ کا شکریہ۔

خواتین دنیا کا مطالعہ پابندی سے جاری ہے ماشاء اللہ یہ رسالہ اپنی شناخت بناتا جا رہا ہے۔ مضامین و کہانیوں کا انتخاب بہت معیاری ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں رینو بہل کی کہانی 'کرپا' اور رخشندہ روحی کی کہانی 'محبت' بہت ہی دلچسپ اور دل کو چھو لیتی ہیں۔ 'مجازی خدا' بہت ہی آسان زبان میں موجودہ معاشرہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ تحریک نسواں اور چند اردو ناول، ناز آفرین نے بڑی محنت سے تحریر کیا ہے اور تحریک نسواں کے اتار چڑھاؤ نے کس طرح ہمارے ادب کو متاثر کیا ہے اس کو واضح طور سے پیش کیا ہے۔ دیگر مضامین بھی بہت ہی عرق ریزی سے تحریر کیے گئے ہیں اور ریسرچ اسکالرس کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد ہیں۔ کامیاب خواتین کے تعلق سے جو پیش کیا جاتا ہے وہ بہت مفید اور نوجوان خواتین کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ حسن سخن کے ذریعہ نوجوان خواتین کی شاعری سے متعارف ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔ باورچی خانہ کے ذریعے نئی نئی طرح کی ڈشز اور مشروبات بنانے کے آسان طریقے ملتے ہیں۔ خدا کرے رسالہ اسی طرح پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے۔ آمین۔

ندا حیات، حیدر گنج لکھنؤ (یوپی)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فلکیاتی بستہ

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 65 روپے

فلکیاتی نظارے

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 60 روپے

خواتین کی اختیارکاری وصنفی مساوات

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 302
قیمت: 145 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت: 185 روپے

انتخابِ سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اوّل ودوم)

مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

عروجِ فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

انتخابِ سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 321
قیمت: 155 روپے

صرف تمھارے لیے

مصنف: ڈاکٹر سمتیندر رانا ڈگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 50
قیمت: 50 روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

بین الاقوامی قانون

مصنف: محمد ظفر محفوظ نعمانی
صفحات: 264
قیمت: 135 روپے

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327
قیمت: 155 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2018, Vol. 02, Issue: 8 RNI. No. DELURD/2017/74026
National Council for Promotion of Urdu Language ISSN 2581-4826
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025